

ہندی ناول نگاری عشق و شہسوار

اب اور کتنی دیر یہ دہشت، یہ ڈر، یہ خوف
گردِ شہسوار، lovers group، digest novels

شام آرہی ہے، ڈوبتا سورج بتائے گا
تم اور کتنی دیر ہو، ہم اور کتنی دیر

کوئی بھی سحر نہ چھوٹو مجھے بے جان رہنے دو
میں اک ویراں جزیرہ ہوں مجھے سنسان رہنے دو
مجھے معلوم ہے مر جھانگے ہیں پھول پھر بھی تم
میرے کمرے میں بس یہ آخری گل دان رہنے دو
تھکن کیسے اتارو گے بھلا اونچی اڑانوں کی
سنو پرکاش ڈالو تم، نئی اڑان رہنے دو
ہزاروں امتحانوں کا کیا ہے سامنا نہیں کر
ہمارے واسطے بھی زیست کو آسان رہنے دو
میرے اپنوں نے گھوٹا ہے گلہ میری امیدوں کا
میرے اپنوں میں بھی میری جان رہنے دو
بھلا کر کے بھلائی کی امیدیں ہم نے رکھی تھیں
عقل مندی نہ رہاں آئی، ہمیں نادان رہنے دو!
یہ مانا خشک پتا ہوں مگر اے محسنو پھر بھی
نہ یوں پاؤں تلے روندو، کوئی پہچان رہنے دو
کسی کو وقت آخر کاش ہم بھی اپنا کہہ پاتے
یہی خواہش تھی اک اپنی یہی ارمان رہنے دو!
(شاعر: نازیہ کنول نازی)

تراخ.....!
بڑی بڑی قلعہ نما دیواروں والی قدیم لال حویلی کے
پچھواڑے میں اس وقت بندوبست کی مال سے لٹکنے والی وہ

محض ایک گولی نہیں قیامت تھی جو اس قلعہ نما حویلی کے
اندہر قید سالوں سے زندگی کا بوجھ ڈھونڈنے والی عورتوں کے
دلوں پر قہر کی صورت پہا کر دی گئی تھی۔
بڑے ہال کی ستونوں کے پیچھے چھپی بے آواز روتی
عورتوں کی آواز زاریاں گویا آسمان کے ستونوں سے ٹکرانے
لگی تھیں اور وہ... سبک رو ہوا سی خوب صورت لڑکی جو
اپنی موت کے آخری لمحے تک اپنے گناہ پر شرمندہ یا خوف
زدہ نہیں تھی، دماغ میں لٹکنے والی فقط ایک ہی گولی نے
اسے اوندھے منہ کسی کچے مکان کی کمزور دیوار کی مانند
زمین پر گرانے میں ایک لمحہ نہیں لگایا تھا۔ قلعہ نما حویلی کے
پچھواڑے میں اس وقت جب رات اپنا پچھلا پہرست
روی سے مکمل کر رہی تھی، ایک بے حد خوب صورت،
امول زندگی کا روشن باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا تھا۔
ہال کمرے کے بڑے سے ستون کے ساتھ لگی کھڑی
عمراب عبدالمکریم کو لگا بس زندگی صرف یہیں تک تھی۔
آگے جو وقت اسے دیکھنا تھا اس میں تو محض اندھیرا
ہی اندھیرا تھا۔ گھٹا ٹوپ گھپ اندھیرا.....!
یکفایت دماغ برف ہوا اور اگلے ہی لمحے وہ لہر آ کر زمین
پر گر گئی تھی۔ عورتوں کے بے آواز آنسو مزید شدت اختیار کر
گئے تھے۔

کھٹی کھٹی سسکیوں اور آہوں کی آواز بلند ہوئی تھی مگر اس قلعہ نما قدیم حویلی کی اونچی دیواروں کے اندر اس بے بس مخلوق پر حاکم ان کے بے حس روایت پسند مردوں کو ان آہ و زاریوں اور آنسوؤں کی مطلق پروا نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

”آپ ٹھیک ہیں بابا سائیں؟“ اپنے مضبوط توانا بازو ان کے دونوں کندھوں کے گرد پھیلاتے ہوئے اس نے گویا انہیں سہارا دیا تھا۔ جواب میں ان کا سر آہستہ سے نفی میں ہلاتھا۔

”نہیں..... اب کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتا میں۔“ رونا ان کی شان کے خلاف تھا اور نہ شاید وہ رو پڑتے۔ زارون کی گرفت ان کے کندھوں پر مضبوط ہو گئی تھی۔

”وہ بدکردار تھی بابا..... ضدی اور باغی تھی، آپ نے کچھ غلط نہیں کیا۔“

”یہی تو دکھ ہے، کاش وہ ایسا نہ کرتی، میں روز قیامت اپنے پیارے مرحوم بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گا۔“ کبھی نہ

زمین پر اوندھے منہ گرا نایاب عبدالکریم کا وجود چند لمحے خاک پر تر پڑنے کے بعد ملا خروٹھا ہو گیا تھا۔

سردار عبدالکریم کی بندوق کی نال دھواں اگلتی ملا خرو ان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی تھی۔ اس حویلی کی روایت تھی بدکردار عورتوں کو گولی مار کر مٹی میں سلا دینا اور یہ روایت پوری ہو گئی تھی، ایک اور زندگی باری تھی۔

نایاب عبدالکریم باری تھی۔ نایاب عبدالکریم جو بچپن سے اپنی ذہانت، خوب صورتی اور اچھی عادتوں کی بدولت ان کے دل کے ہمیشہ قریب رہی تھی ملا خرو انہی کی بندوق کی گولی سے قبر کے گھپ اندھیروں میں اترنے والی تھی۔ وہ



اس کا دل چاہا وہ اس کے ہونٹوں اور گالوں کو اپنے ہاتھ کی انگلیوں کی نرم پوروں سے چھوئے اور یہ دیکھے کہ کیا وہ واقعی مرگئی تھی یا زندہ تھی؟

بیگم عبدالکریم ایک کونے میں گھٹنوں پر سر رکھے یوں بیٹھی تھیں جیسے اب دنیا میں ان کا کچھ باقی ہی نہ ہو۔

وہاں اس بڑے سے صحن میں کون ان کی لاڈلی بیٹی کے لیے رو رہا تھا، کون آہ و زاری کر رہا تھا انہیں مطلق خبر نہیں تھی۔

اندر اپنے شاندار کمرے میں بیٹھے سردار عبدالکریم کا حال سب سے الگ تھا۔ چھلی رات کے آخری پہرے اس وقت تک وہ ایک مل بھی نہیں سوئے تھے۔ دھیان کے درپچوں سے بار بار ایک چھوٹی سی چار پانچ سالہ خوب صورت بچی دو پونیاں بنائے مسکراتی ہوئی انہیں گویا ذبح کر رہی تھی۔

آج سے پہلے سالوں سے بہت سی عورتیں بدکرداری کے الزام میں، اس حویلی کے چاہر مردوں کی گولی کا شکار ہوئی تھیں مگر کسی کے لیے بھی دل میں ویسا درد نہیں اٹھا تھا جو درد نایاب عبدالکریم کی موت نے دل میں گاڑ کر رکھ دیا تھا۔

بہت دنوں کے بعد اس روز حویلی کی اونچی دیواروں سے دھوپ اندر صحن تک آئی تھی۔ بڑے ہال کی سیڑھیوں پر پلر سے ٹیک لگائے بیٹھی محراب عبدالکریم، خجڑے ہوئے سفید چہرے کے ساتھ بالکل سن بیٹھی تھی، اس کی نظر کے بالکل سامنے صحن میں بے قراری سے پھدکتی چڑیا تھی جس کو وہ مسلسل دیکھ رہی تھی جب وہ چپکے سے اس کے پہلو میں آ کر بیٹھ گیا۔

”کیسی ہو..... کیا بہن یاد آ رہی ہے؟“ اس کی آواز
مخرباب عبدالکریم کے لیے سانپ کی پھنکار سے کم نہیں
تھی۔ وہ چونکی اور بے ساختہ بدک گردور ہوئی تھی۔

”دور ہو مجھ سے..... تم جیسا انسانی شکل میں خونخوار
بھڑما میں نے آج تک نہیں دیکھا۔“

کمزور پڑنے والا سردار اس لمحے جذباتی ہو رہا تھا۔ زارون انہیں کندھوں سے تھامے حویلی کے کچھواڑے سے ان کے شاندار کمرے میں لے آیا تھا۔

”فی الحال آپ کو آرام کی ضرورت ہے، آپ آرام کریں، میں جب تک اس کی لاش کو ٹھکانے لگانے کا انتظام کرتا ہوں۔“

”نہیں..... اس کا نماز جنازہ ہوگا۔“

”بابا سائیں..... یہ کیسے ممکن ہے آج تک اس حویلی میں کاروکاری ہوئی کسی عورت کا نماز جنازہ نہیں ہوا۔“

”نایاب عبدالکریم کا ہوگا..... یہ میرا حکم ہے۔“ ان کے چہرے پر جلال آ گیا تھا۔ زارون عبدالرحیم کو مجبوراً سر جھکا کر اٹھا۔

”ٹھیک ہے بابا سامیں..... جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“

”لاش کو زنان خانے میں بھجوا دو، جس نے جو پڑھنا ہے پڑھ لے، صبح فجر کے بعد جنازے کا اعلان کروادینا۔“

”جی بہتر بابا سامیں۔“ دل میں غصہ دبائے بظاہر فرماں برداری سے کہتا وہ ان کے کمرے سے نکل گیا تھا، نکلت نکلت ادھوری رہ گئی تھی۔ وہ اسے عبرتناک موت کے بعد، گناہ قبر دینا چاہتا تھا مگر ایسا نہیں ہوا تھا آسمان پر بیٹھے سب سے بڑے منصوبہ ساز نے اس کے سارے ارادے مٹی کر دیے تھے۔

☆ ☆ ☆

حویلی کے بڑے سے صحن میں سفید کفن میں لپٹا اس کا
چہرہ پر نور تھا، وہ مسکرا رہی تھی۔ اپنی ناگہانی اندوہناک
موت پر۔

محراب جس کا دماغ اب بھی سن تھا وہ آنکھیں
بھاڑے بے حد حیرانی سے اس کے صبح پر نور چہرے پر بکھرا
سکون اور ان شگرفانی لبوں پر کھلتی مسکراہٹ کو دیکھ رہی
تھی۔

”کیا واقعی موت کسی انسان کو اتنا آسودہ کر دیتی ہے جتنا امام عبدالمکریم کو کر دیا تھا؟“

”اچھا.....؟“ لیوں پر دلفریب مسکراہٹ سجاتے ہوئے وہ کھڑا ہوا۔

”یعنی تم مان رہی ہو کہ میں اصول ہوں۔“

”تم جانور ہو جانور۔“

”ہااا..... کیا خیال ہے پھر اپنی زوجیت میں نہ لے لوں تمہیں، ذرا تم بھی دیکھ لو، ایک جانور کے ساتھ ایک ہی کمرے میں، ایک ہی بستر پر زندگی کیسے بسر ہو سکتی ہے۔“ مسکرا کر کہتے ہوئے اس لیے وہ اسے زہر سے بھی برا لگ رہا تھا۔ تب ہی وہ پھٹکارا ہی تھی۔

”سوچنا بھی مت کہ کبھی میں جیسے درندے کے ساتھ ایک شام بھی بسر کروں گی۔“

”سوچ تو لیا ہے۔ اب کیا کروں؟“ اس کے لیوں پر ہنوز دل جلانے والی مسکراہٹ تھی۔

محراب عبدالکریم کی آنکھیں ضبط کی ہزار کوششوں کے باوجود بھرا آئیں۔

”اگر سوچ لیا ہے تو دل سے نکال دو کیونکہ میں نایاب عبدالکریم نہیں ہوں جو تم جیسے بد ارادوں کی بھیئت چڑھ جائے گی، میرے ساتھ کچھ بھی برا کرنے سے پہلے سوچ لینا، محراب عبدالکریم اس حویلی کے کسی مرد کی گولی کا شکار نہیں ہوگی۔“

”اچھا..... کیا کرو گی؟“ وہ کہاں اس اسے مرعوب ہونے والا تھا۔ محراب نے فوراً آنسو پونچھ لیے تھے۔

”اس حویلی کے بے ضمیر سفاک مردوں کے کسی بے رحم فیصلے کی بھیئت چڑھنے سے پہلے ہی میں اپنی جان خود لے لوں گی۔“

”اوہ..... یعنی خودکشی کرو گی، اپنے مذہب کے خلاف جا کر۔“ ایک مرتبہ پھر وہ مسکرایا۔

محراب کی آنکھوں میں شرارے دوڑ گئے، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سامنے کھڑے اس شخص کو کچا چبا جاتی تب ہی دانت پیستے ہوئے بولی۔

”تم مذہب کی بات کر رہے ہو..... جس کا اپنا ہر عمل اپنے مذہب کے خلاف ہے۔“

”چلو دیکھتے ہیں پھر یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔“ اس کی آنکھوں سے ہنوز شرارت فٹک رہی تھی۔

محراب نفرت سے تھوکتی واپس پلٹ گئی تھی۔

اندر اپنے کمرے کے بیڈ پر اوندھے منہ گرتے ہی کب سے رکے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا تھا، بچکے کو ہاتھوں میں بھینچ کر وہ اتنی شدت سے روئی کہ باہر وسیع برآمدے میں نماز پڑھتی مریم بیگم سلام پھیر کر سیدھی اس کے پاس آئی تھیں۔

”محراب..... بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ کر انہوں نے اس کی پشت سہلائی جب وہ فوراً آنسو صاف کرتے ہوئے اٹھ بیٹھی تھی۔

”جی امی۔“

”کیا بات ہے بیٹے، اس طرح کیوں رو رہی ہو؟“ ان کے لہجے میں فکر تھی۔

محراب سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

”کچھ نہیں امی..... بس ویسے ہی تابیاب یاد آ رہی تھی۔“

اس کے پاس رونے کا جواز تھا مگر اس ماں کو جھوٹ سے مطمئن کرنا آسان نہیں تھا تب ہی وہ بولیں۔

”تو اب تم نے جھوٹ بولنا بھی سیکھ لیا ہے محراب؟“

”جھوٹ نہیں بول رہی امی، بس اب اس حویلی میں دل نہیں لگتا، میرا دم گھٹتا ہے، جی چاہتا ہے یہاں سے کہیں دور بھاگ جاؤں۔“

”بھاگ جانا مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔“

”تو کیا کروں..... پھر تابیاب کی طرح اسی چار دیواری میں کسی گولی کا انتظار کروں؟“

”اللہ نہ کرے محراب..... کیوں ایسی باتیں کر رہی ہو؟“ وہ دہل اٹھیں۔ محراب نے گال رگڑ لیے۔

”ہم اس حویلی میں خوش نہیں رہ سکتے امی، پلیز تانا کے گوشہ چلیں۔“

”لھیک ہے میں کچھ سوچتی ہوں مگر..... فی الحال تم خود کو سنبھالو، اللہ نے چاہا تو سب اچھا ہوگا۔“

”جی امی“

”چلو اٹھو اب نماز پڑھ لو، وقت نکلا جا رہا ہے۔“ خود شکست دل ہونے کے باوجود وہ اسے تسلی دے رہی تھیں۔
مخرب اثبات میں سر ہلاتی دھوکے لیے اٹھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

سرخ اینٹوں سے قدیم طرز پر تعمیر اس قلعہ نما لال حویلی میں قیام پاکستان سے پہلے میثم سردار عبدالرؤف کا آس پاس کے سارے علاقے پر قبضہ تھا، وہ ایک چابہ مگر انصاف پسند حاکم تھے۔

اپنے خاندان اور علاقے کے لیے ان کے بنائے گئے قوانین میں کہیں کسی رو بد دل یا نری کی گنجائش نہیں تھی۔

اس حویلی سمیت علاقے کی کسی عورت کو سوائے قرآن پاک کے دنیاوی تعلیم کی اجازت نہیں تھی۔ اس حویلی یا علاقے کی کسی عورت کی بد کرداری ثابت ہو جانے کے بعد اسے وہیں اس علاقے میں گھر کے سربراہ کے ہاتھوں موت کی تاریک وادی میں اتار دیے جانا سالوں کی روایت تھی جو تاحال چلی آ رہی تھی۔ دینی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود وہ لوگ اپنے فیصلوں میں دین کے احکامات کو نظر انداز کر رہے تھے مگر کسی میں مذمت کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ سردار عبدالرؤف جیسے سخت دل سردار کے سامنے کھڑے ہو کر ان کے بنائے گئے کسی قانون پر سوال اٹھانا گویا موت کے مترادف تھا۔

سردار عبدالرؤف کا گھرانہ تین بیٹوں پر مشتمل تھا، ان کے بڑے بیٹے سردار عبدالرحیم انہی کی طرح، انصاف پسند اور قدیم روایات پر سختی سے عمل کرنے والے سردار تھے۔ سردار عبدالرؤف نے ان کی شادی، اپنی بیوی کی زندگی میں ہی ان کی بھانجی سے طے کر دی تھی، جس سے ان کے بچے بعد دیگرے تین بیٹے پیدا ہوئے۔

سردار عبدالرحیم کے بعد سردار عبدالکریم کا نمبر تھا جو روایت پسندی میں اپنے باپ اور بھائی سے قطعی مختلف تھے، شاید اسی لیے قدرت نے انہیں اوپر تلے دو بیٹیوں سے نوازا۔ بعد ازاں کسی بچپیدگی کے باعث ان کی بیوی

ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہو گئی تھیں۔ سردار عبدالکریم کے بعد سردار عبداللطیف اس حویلی میں سردار عبدالرؤف کے آخری سپوت تھے۔ جن کی اولاد میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہی تھے، سردار عبدالرحیم کے بڑے دونوں بیٹوں کی شادی، سردار عبدالرؤف کی زندگی میں ہی ہو گئی تھی، تاہم اس شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد انہوں نے اپنی موت سے فقط چند دن پہلے ان کے آخری سپوت زارون عبدالرحیم کا رشتہ بھی سردار عبدالکریم کی لاڈلی محبوب بیٹی نایاب عبدالکریم کے ساتھ طے کر دیا تھا۔

ناياب، تا صرف اپنے باپ بلکہ تایا اور دادا کی بھی بے حد لاڈلی تھی تب ہی بچپن سے ہی اس کی ہر خواہش بن کہے پوری کی جاتی تھی۔ مخرب اس سے پورے تین سال چھوٹی تھی مگر اس کے باوجود دونوں بہنوں میں مثالی دوستی اور پیار تھا۔ سردار عبداللطیف کا بیٹا عباد ایک محبت کرنے والا حساس نوجوان تھا اسی لیے مخرب اسے پسند کرتی تھی اور نایاب یہ بات جانتی تھی مگر اس سے پہلے کہ اس کے خواب پورے ہوتے لال حویلی بھی ایک طوفان کی نذر ہو گئی۔ موٹی گڑیا جیسی وہ پیاری سی لڑکی جس میں اس حویلی کے حاکم مردوں کی جان تھی، بے قصور اس علاقے کے اندھے قانون کی بھینٹ چڑھ کر، اسی حویلی کے حاکم مردوں کے ہاتھوں زندگی کی بازی ہار گئی تھی۔

ناياب عبدالکریم کی ناگہانی موت کے بعد بیگم عبدالکریم تو زندہ لاش بن کر رہ گئی تھیں۔ مخرب خود بھی پھر کا مجسمہ بن کر رہ گئی تھی۔ زارون عبدالرحیم جو پہلے نایاب عبدالکریم کے لیے درد سر تھا اب وہ بلا اس کی ناگہانی موت کے بعد مخرب عبدالکریم کے گلے آ پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

لال حویلی میں اگلے بہت سے دن خاموشی سے بسر ہو گئے تھے جب اس رات کھانے کی میز پر بیگم عبدالرحیم نے گویا دھماکہ کر دیا تھا۔ وسیع دستر خوان پر سب ہی افراد موجود تھے جب خاموشی سے کھانے کے دوران اپنے شوہر کے اشارے پر انہوں نے بیگم عبدالکریم کو مخاطب

کرتے ہوئے کہا تھا۔

”مجھے تم سے کچھ بات کرنی تھی مریم۔“ وہ جو روٹی لینے کے لیے ہاٹ پاٹ کھول رہی تھیں ان کے یوں اچانک خود کو کھانا طلب کرنے پر چوکی تھیں۔

”خیریتا یا؟“

”ہوں..... سب خیریت ہے۔“

”جی کہیں ایسی کیا بات ہے جو سب کی موجودگی میں ضروری ہے۔“

”بات ہی ایسی ہے سب کے سامنے ہی کھولی جائے تو بہتر ہے تم جانتی ہو اب مرحوم نے زارون اور نایاب بیٹی کا رشتہ دل سے طے کیا تھا، اب نایاب تو اس دنیا میں نہیں رہی تو عبدالرحیم سائیں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم زارون اور محراب کا نکاح کر دیتے ہیں، بیٹی کے لیے تمہاری پریشانی بھی ختم ہو جائے گی اور اب مرحوم کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔“

وہ وہی بول رہی تھیں جو ان سے کہا گیا تھا مگر مریم بیگم کا ہاتھ وہیں فریز ہو گیا تھا۔ زارون کی عادات، اس کے مشاغل اور فطرت سے وہ اچھی طرح آگاہ تھیں پھر کیسے ایک کے بعد دوسری بیٹی کا مستقبل داؤ پر لگا دیتیں تب ہی ہمت کر کے سر جھکاتے ہوئے بولیں۔

”آپ کی خواہش سر آنکھوں پر بھابی جان مگر میں معافی چاہتی ہوں، میرے اور محراب کے دل میں ابھی تابیاب کا تم تازہ ہے، میں ابھی محراب کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔“

محراب کی آنکھوں سے ان کے لفظوں پر دو موتی
 ٹوٹ کر گرے تھے جبکہ عبادت کب کا وہاں سے اٹھ کر جا چکا
 تھا۔

اب تک خاموشی سے کھانا کھاتے زارون عبد الرحیم نے کن انکھیوں سے اسے کھانا چھوڑ کر جاتے ہوئے دیکھا اور مسکرایا تھا۔ محبت کرنے والے تخلص اور حساس دلوں کے ساتھ کھیلنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ بیگم عبد الرحیم کو شاید یوں صاف انکار کی توقع نہیں تھی تب ہی گڑبڑا کر شوہر کی

طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

”ہمیں جلدی نہیں ہے مریم... تم اچھی طرح سوچو
وہ چار کر کے نسل سے جواب دے دینا، اصل میں یہ میرے
بیٹے کی بھی خواہش ہے جبکہ سردار صاحب بھی یہی چاہتے
ہیں کہ سردار عبدالکریم سامیں کے بعد وہ اپنی نیم جی کو
اپنی آنکھوں کے سامنے رکھیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے بھائی جان مگر ابھی یہ بات مجھے مناسب نہیں لگ رہی، مجھے تھوڑا وقت دیں، میں سوچ کر جواب دوں گی۔“

”ٹھیک ہے..... ہمیں کوئی اعتراض نہیں مگر ایک بات کا انھوں نے سن لو مریم..... محراب ہماری بیٹی، ہمارا خون ہے، اس کے مستقبل کا فیصلہ ہم کریں گے، تمہاری رضا مندی صرف اس لیے ضروری ہے کیونکہ تم ماں ہو، بیٹی کو پالا ہے تم نے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اس جو بیٹی کی روایات یا ابا مرحوم کی خواہش کے خلاف جانے کا تصور بھی کرو، سمجھتی ہو ناں۔“

سردار عبدالرحیم صاحب نے پہلی بار ان دونوں نواتین کے درمیان بات چیت میں مداخلت کی تھی۔ محراب ان کے سخت لب و لہجہ پر نفرت سے سامنے بیٹھے زارون کو دمکھتی دسترخوان سے اٹھ گئی تھی۔ اس کے یوں اٹھ کر چلے جانے پر سردار عبدالرحیم اور سردار عبداللطیف دونوں کی آنکھوں میں سرخی اتری تھی مگر وہ ضبط کر گئے تھے۔ مریم بیگم کا جھکا سر، جھکا ہی رہ گیا تھا، بہت کچھ کہنے کی خواہش اندر رہی کہیں سرخ کر رہ گئی تھی۔

وہ ماں تھیں مگر ایک ایسی ماں جسے شوہر کا مضبوط ستون میسر نہیں تھا۔ جس چار دیواری میں وہ مقید تھیں وہاں انہیں اپنا ہر معاملہ رب العزت کے سپرد کر کے خود صبر کرنا تھا اور وہ یہی کر رہی تھیں۔

رات کا جانے کو ن سا پہر تھا جب اسے اپنے کندھوں
پر کسی کی مضبوط گرفت کا احساس ہوا تھا۔ پٹ سے
آٹھ کھینٹیں کھلیں تو نظر کے سامنے عباد عبد العلیف کو دیکھ کر وہ

حیران ہی تو رہ گئی تھی۔ بھلا رات کے اس پہر وہ اس کے کمرے میں کیا کر رہا تھا؟

عباد عبداللطیف نے اس کی حیران آنکھوں کا سوال پڑھ لیا تھا تب ہی سرگوشی میں بولا۔

”بات کرنی ہے تم سے، میرے پیچھے آؤ۔“

وہ از حد سنجیدہ تھا۔ محراب دھڑکتے دل کے ساتھ دوپٹا سنہا لٹی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ عباد کی تیزی سے چلتے قدم حویلی کے پچھواڑے میں طویل برآمدے کے کنارے پر چار کے تھے۔

”یہاں بیٹھو..... کچھ پوچھنا ہے تم سے۔“ محراب دیکھ سکتی تھی اس کی غلافی آنکھوں میں عجیب سا حزن تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ طویل برآمدے کی سیڑھیوں پر نکل گئی تھی۔

”کچھ بھی پوچھنے کے لیے رات کا یہ پہر مناسب نہیں ہے۔“

”جانتا ہوں مگر صبح تک انتظار نہیں کر سکتا تھا۔“

اس سے کچھ فاصلہ رکھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے وضاحت دی تو محراب خاموش رہی تھی۔

”نایاب بے قصور تھی؟“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا تھا جب وہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔

”ہاں.....“

”کوئی ثبوت؟“

”کسی ثبوت کی اب کوئی اہمیت نہیں، وہ جا چکی ہے دنیا سے۔“

”تم یہاں تھیں ناں، تمہیں پتا تھا ناں سب؟ ایک فون نہیں کر سکیں مجھے؟ میں یہاں ہوتا تو یہ انہونی کبھی نہ ہوتی۔“

”کیا کرتے آپ..... بڑے تایا کے فیصلے سے نکراتے؟“

”ہاں..... میں مرد تھا نکلا سکتا تھا، غلط فیصلے سے باز رکھ سکتا تھا انہیں۔“ وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ محراب کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

”ممکن ہے ایسا ہوتا مگر میرے اور نایاب کے پاس کوئی مہلت ہی نہیں تھی رات کو فیصلہ سنایا گیا اور صبح اذان سے پہلے گولی مار دی گئی۔“

”تم نے تایا کو بچھڑانے کی کوشش کی؟“

”نایاب نے کی تھی مگر زارون نے اس کی جوشی نہیں جانے دی۔“

”زارون کو کیا مسئلہ تھا اس سے؟“

”ایک راز ہاتھ لگ گیا تھا اس کا نایاب کے ہاتھ، نایاب نے اسے دھمکی دی تھی کہ وہ اسے حویلی میں ضرور بے نقاب کرے گی، اسی لیے اس نے اس کی موت پلان کر لی۔“

”ہوں..... کیا تمہیں پتا ہے اس کا راز کیا تھا؟“

”ہوں..... بتایا تھا نایاب نے، کسی لڑکی کے ساتھ حالت غیر میں رکنے ہاتھوں پکڑ لیا تھا اس نے اسے۔“

”کیا..... وہ جانتا ہے کہ تم اس راز سے آگاہ ہو؟“

”ہاں.....“

”پھر بھی شادی کرنا چاہتا ہے وہ تم سے؟“

”ہاں..... کیونکہ اس کی شروعات سے مجھ پر نظر ہے، نایاب کی موت بھی اسی لیے پلان کی اس نے تاکہ ایک تو حویلی کے مردوں کی نظر میں اس کا ایجنڈا خراب نہ ہو، دوسرا نایاب اس کے راستے کی رکاوٹ نہ بنے۔“

”تم کیا چاہتی ہو؟“

”میری چاہت کسی کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی، عورت ذات جو شہری میں۔“ وہ اداس اور مایوس تھی۔ عباد گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”میرے لیے تمہاری مرضی جاننا ہر مسئلے سے زیادہ اہم ہے محراب۔“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔

”محراب نے آنسو پونچھ لیے تھے۔

”اپنی بہن کے قاتل سے شدید نفرت ہے مجھے۔“

”اور میرے بارے میں کیا رائے ہے تمہاری؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا، محراب کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں، اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ جس کی چاہت خون بن

میں جمال کی کے بیٹے نے اسے سر لے لیا ہے، اب
پچاسی بھی چڑھ گیا تو خیر ہے پیچھے گھر والے تو کچھ عرصہ
پیٹ بھر کر کھائیں اور سوئیں گے۔“ کسی کی مجبوری اور
جھوک کو پیسوں میں خرید کر وہ آ سوہہ تھے۔ زارون سر ہلا کر
رہ گیا۔

”گنڈ۔۔۔ سناپ بھی مر گیا اور لاش بھی نہیں ٹوٹی۔“
 ”آہو۔۔۔ ایک سن سر پر ہے، اب بچے کی ایک
 ”فلطی“ کی وجہ سے سردار رئیس سیٹ تو نہیں ہار سکتا
 ”ہاں۔“

”یہ تو ہے..... ویسے بھی یہ کی کمین، غریب حزارے
 اسی لیے تو ڈیڑیوں کے نمک پر پلٹے ہیں کہ ضرورت پڑنے
 پر کام آسکیں، خیر چھوڑیں مجھے آپ سے کچھ اور بات کرنی
 تھی۔“ ہنسا وقت ضائع کیے وہ اپنے مطلب کی بات پر
 آیا۔ سردار عبدالرحیم اٹھتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گئے تھے۔
 ”کہو کیا بات ہے؟“

”مخرب کے بارے میں بات کرنی تھی بابا
سائیں۔“

”خواب کے بارے میں..... خیر تو ہے؟“ وہ چونکے
ساتھ ہی بیگم عبدالرحیم بھی سلام پھیر کر اس کی طرف متوجہ
ہوئیں۔ تب ہی وہ بولا۔

”جی بابا سب خیر ہے..... بس کل کھانے کی میز پر جس طرح سے مریم چچی نے امی حان سے معذرت کی،

بہت سوچتا رہا ہوں میں اسے۔ دیکھیں بابا، چچی اور محراب
شاید ابھی تایاب کو بھول نہیں پائے ہیں پھر چچا جان بھی
حیات نہیں اور شاید تایاب والے واقعے کے بعد محراب مجھ
سے شادی پر خوش بھی نہیں ہے تو میں نہیں چاہتا یہ رشتہ
زبردستی قائم ہو یا انہیں لگے کہ ہم ان کے ساتھ کوئی زیادتی
کر رہے ہیں اس لیے میری آپ سے درخواست ہے کہ
آپ مریم چچی یا محراب پر اس رشتے کے لیے کوئی دباؤ
نہیں ڈالیں گے پلیز۔" وہ سردار عبدالرحیم کا لاڈلہ تھا اور
انہی باتوں کی وجہ سے تھا اب بھی اس کے الفاظ پر وہ مسکرا
دئے تھے۔

کر رہی ہیں دوڑ رہی ہے وہ خود سے کبھی اس سے یہ سوال بھی کر سکتا ہے، جب ہی ٹپکلیں لرزی اور چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا تھا۔

”مجھے نہیں پتا۔“ اس کا چہرہ اس کے اندر کے حال کی
چغلی کھارہا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

”چلو ٹھیک ہے پھر میں کرتا ہوں اس ذارون
عبدالرحیم کا کوئی بندہ ہست۔“ اس بار محراب نے سراٹھا کر
صرف ایک نظر اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر واپس دوڑ
گئی تھی۔ عباد عبدالطیف کے لیے اس کی مسکراہٹ کسی
انمول خزانے سے کم نہیں تھی، جب ہی اسے خوش دیکھ کر وہ
بھی مطمئن سا اپنے کمرے کی طرف پلٹ گیا تھا۔ ذارون
جو اپنی گرل فرینڈ سے موبائل پر بات کرنے کے لیے اس
طرف آیا تھا ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر اس کے اندر گویا
بھانجڑ جل اٹھے تھے۔ محراب کی مسکراہٹ پر عباد کے
اطمینان نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ اسے نفرت
سے رد کر کے وہ کسی اور کے خواب دیکھ رہی تھی اور یہی تو
اس سے برداشت نہیں ہوا تھا۔ وہ سب کچھ برداشت
کر سکتا تھا مگر اپنی بار نہیں، جب ہی وہیں کھڑے کھڑے
اس کے دماغ نے تیزی سے آگے کی پلاننگ شروع کر دی
تھی۔ نایاب عبدالکریم کے بعد اب اس کا اگلا ہدف محراب
عبدالکریم تھی۔

— ☆ ☆ —

سردار عبدالرحیم اس وقت کسی جرگے سے فارغ ہو کر حویلی واپس لوٹے تھے جب وہ ان کے کمرے میں چلا آیا تھا۔ یگیم عبدالرحیم بھی اس وقت وہیں موجود تھیں، وہ صوفے پر باپ کے برابر میں بیٹھ گیا تھا۔

”السلام علیکم یا سائیں..... کیسا رہا آج کا جرگہ؟“
سردار عبدالرحیم نے محبت سے اپنے جوان سالہ بیٹے کو
دیکھا پھر اپنا بازو اس کے مضبوط کندھوں کے گرد پھیلاتے
ہوئے بولے۔

”رب سائیں کا کرم ہے..... سب کچھ صلح صفائی
سے طے ہو گیا، سردار رئیس کے مٹے کا گناہ پورے دولاکھ

ہو بالکل اپنی بہن کی طرح۔۔۔۔۔ اس بار وہ اسے کھینچے ہوئے زبردستی چھت پر لے آیا۔ محراب کی آنکھیں اپنی بے بسی پر بھیک گئی تھیں۔

”اپنی گندی زبان سے میری بہن کا نام مت لو۔“
”اچھا میری زبان گندی اور تمہاری بہن بہت اچھی تھی ہوں؟“ اس کے گویا تلوؤں پر لگی سر پر بھیجی تھی۔
محراب نے نفرت سے منہ پھیر لیا تھا۔

”یہ جو زبان ہوتی ہے ناں۔۔۔۔۔ یہی تخت سے تختے پر پہنچا دیتی ہے انسان کو مکرم نے اپنی آنکھوں سے اپنی خود سر بہن کا بھیا یک انجام دیکھ کر بھی کوئی سبق حاصل نہیں کیا، چلو خیر اچھی لگتی ہو تم دل کو تمہارے ساتھ تمہاری بہن والا سلوک نہیں کروں گا میں۔۔۔۔۔ شکر مناد۔“

”بکواس بند کرو اپنی۔“
”بکواس تو ابھی شروع ہی نہیں کی میں نے۔۔۔۔۔ تمہیں پتا ہے ٹایاب کے کالج میں داخلے کے لیے اپنے بابا کو سب سے زیادہ رضا مند کرنے والا واحد شخص میں تھا اگر میں بابا کو کوئی شے نہ کرتا تو تمہارے بابا کی ضد بھی ان کے فیسے کے آگے کچھ نہیں کر سکتی تھی مگر میرے اس احسان کے بدلے تمہاری بہن نے کیا کیا؟ میرے قطعی پرسل معاملے کو ہوا بنا کر مجھے ہی دھمکانے پر اتر آئی، اگر وہ یہ حماقت نہ کرتی تو مجھے کیا ضرورت تھی اس کی موت پلان کرنے کی، نہ وہ مجھے قصہ دلاتی نہ میں اپنے دوست کو اس کے کمرے میں بھیج کر حویلی میں اس کی بدکرداری ثابت کرتا، تم خود بتاؤ کیا اپنی موت کے لیے وہ خود قصور وار نہیں۔“

وہ پر اعتماد تھا اپنے کسی عمل پر اسے کوئی شرمندگی نہیں تھی۔ محراب کا دل چاہا وہ اس کا منہ بوج لے۔
”چپ کر جاؤ تم۔۔۔۔۔ اللہ کا واسطہ ہے تمہیں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ چلائی اور زارون مسکرا دیا۔

”چلو ہو جاتا ہوں چپ۔۔۔۔۔ بابا اور امی کے سامنے تمہاری ذات سے بھی دشمن وار ہو گیا ہوں میں، جاؤ کرلو عباد سے شادی، کیا یاد کرو گی تم بھی کہ کس نئی سے پالا پڑا

”شبابش میرے شیر۔۔۔۔۔ مجھے فخر ہے کہ تم میرے بیٹے ہو۔“ بیگم عبدالرحیم کے چہرے پر بھی فخر یہ مسکراہٹ دہائی تھی۔

”زبردستی بنائے جانے والے رشتے کبھی کامیاب بھی نہیں ہوتے بیٹے۔۔۔۔۔ تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے، جہاں تک میرا خیال ہے مریم عباد بیٹے کو اپنا داماد بنانا چاہتی ہے۔“ وہ کچھ سوچ کر بولے۔ ”کوئی نہیں، عباد بھی اپنا ہی خون ہے۔۔۔۔۔ میں کرتا ہوں عبداللطیف سے بات۔“ سردار عبدالرحیم کے چہرے پر اطمینان تھا۔

زارون اثبات میں سر ہلاتا وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بیگم عبدالرحیم نے سردار عبدالرحیم سے کہا۔

”دیکھ لیں سردار صاحب۔۔۔۔۔ ہمارے زارون کا دل کتنا بڑا ہے۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ یہ تو ہے۔“ وہ خود بھی اپنے بیٹے کے اس فیصلے سے متاثر ہوئے تھے۔

یہ اسی شام کی بات تھی جب زارون نے پھر محراب عبدالکریم کا راستہ روک لیا تھا۔ عباد حویلی میں موجود نہیں تھا جبکہ سردار عبدالرحیم اور سردار عبداللطیف دونوں ڈیرے پر تھے، گھر کی بزرگ تینوں خواتین اکٹھی بیٹھی اپنی باتوں میں مگن تھیں جب چھت سے اترتی محراب کے رستے میں وہ آ گیا تھا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“

”تم سے مطلب؟“

”مطلب بہت ہیں۔۔۔۔۔ بس تم سمجھتی نہیں ہو خیر آؤ کچھ بات کرنی ہے تم سے۔“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے اس کی کلائی پکڑ لی تھی۔ محراب کو بے حد برا لگا تھا۔

”کلائی چھوڑو میری۔۔۔۔۔ تم جیسے گھٹیا انسان کے ساتھ مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ چلو پھر گھٹیا تو گھٹیا ہی سہی، جتنا میں کوشش کرتا ہوں تمہارے معاملے میں بندہ بننے کی، اتنا ہی تم اپنی زبان کے ناجائز استعمال سے مجھے برا بننے پر مجبور کرتی

زارون کی بجائے عباد بیٹے کے ساتھ طے کر دیا ہے، صرف یہی نہیں انہوں نے تمہیں شہر کے بڑے مدرسے میں عالمہ کا کورس کرنے کی اجازت بھی دے دی، لانے لے جانے کی ذمہ داری عباد بیٹے کے سر ہوگی اور اس سے بھی بڑی خوش خبری یہ ہے کہ زارون کا امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا ہے، اگلے چند روز تک وہ پاکستان سے باہر چلا جائے گا۔“ محراب دیکھ سکتی تھی ان کا چہرہ کچی خوشی سے دمک رہا تھا۔ وہ رو پڑی تھی۔

”آپ سچ کہہ رہی ہیں امی؟“

”ہاں میری جان..... ابھی نماز کے بعد سردار صاحب اور بھابی جان نے مجھے خود اپنے کمرے میں بلا کر بات کی ہے، سردار عبداللطیف بھائی اور بھابی زینب بھی وہیں موجود تھیں۔“

”یہ تو بہت بڑی بے یقینی کی بات ہے امی..... میرا دل تو اس پر یقین ہی نہیں کر رہا، بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”آنسوؤں کے موتی اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر گود میں گر رہے تھے۔ مریم بیگم نے اسے محبت سے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

”سب اللہ کا کرم ہے محراب..... وہ جو چاہے کر سکتا ہے، یقیناً میری نایاب کی قربانی رائیگاں نہیں گئی، سردار عبدالرحیم تمہیں خوشیاں سونپ کر نایاب کے ساتھ ہوئی زیادتی کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو امی..... جانے کیوں میرا دل عجیب سی بے چینی اور وہم کا شکار ہو رہا ہے، یوں جیسے پھر سے کچھ برا ہونے والا ہو، زارون سے کسی بھی تباہی کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔“

”پاگل مت، بنو محراب..... اللہ نے چاہا تو اگلے چند روز میں سب کچھ بہتر ہو جائے گا اور پھر زارون جا رہا ہے ناں، اس سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں..... بس ایک بار عباد بیٹے کے ساتھ نکاح ہو جائے تمہارا پھر کوئی کچھ بھی کر لے تمہارا بال بیک نہیں کر سکتا۔“

”ہے۔“ اس وقت جو مسکراہٹ اس کے لبوں پر رقصاں تھی محراب اس سے خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اس کے الفاظ اس کی کسی نئی پلاننگ کی چغلی کھا رہے تھے۔ وہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھی جبکہ زارون بائیں ہاتھ سے اس کے بال بکھیرتا سبز حیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔

﴿.....☆.....﴾

عباد اس رات قدرے تاخیر سے حویلی لوٹا تھا۔ محراب آدھی رات تک بے چینی سے کروٹیں بدلتی اس کی واپسی کا انتظار کرتی رہی تھی۔ چائے کی بات بھی جب سے زارون نے اس سے بات کی تھی اس کا دل گویا کونکوں پر جلنے لگا تھا۔ کیا کرنا چاہتا تھا وہ اس کے ساتھ؟

یہ تو طے تھا کہ وہ اسے مروانا نہیں چاہتا تھا، شادی سے وہ خود پیچھے ہٹ رہا تھا تو آگے اس کی کیا پلاننگ ہو سکتی تھی، سوچ سوچ کر اس کی شریانیں پھٹنے لگی تھیں۔ پوری رات انگاروں پر لوٹنے کے بعد صبح وہ فجر کی نماز کے لیے بستر سے نکلی تو جسم بخار کی زد میں تھا۔ بالمشکل ہمت کر کے اس نے وضو کیا اور نماز پڑھی، ابھی سلام پھیر کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ مریم بیگم وہاں چلی آئیں، ان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ محراب کا دل دھڑکا، جلدی جلدی دعا مانگ کر وہ ان کے قریب آئی۔

”امی..... کوئی بات ہوئی ہے؟“

”ہاں..... میری جان، یوں سمجھو ناممکن ممکن ہوا ہے۔“ اس کا منہ چوم کر مسکراتے ہوئے انہوں نے بتایا۔ محراب نے ان کے دنوں ہاتھ محبت سے تھام لیے تھے۔

”ایسا کیا ہو گیا ہے جو آپ اتنی خوش دکھائی دے رہی ہیں۔“

”بات ہی ایسی ہے میری جان..... تم بھی سنو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔“

”اچھا ایسا کیا ہو گیا ہے صبح صبح؟“ وہ حیران ہوئی۔

”مریم بیگم پھر مسکرائیں۔“

”اللہ نے بڑا کرم کیا ہے محراب..... سردار عبدالرحیم اور بھابی نے اپنی پوری رضامندی کے ساتھ تمہارا نکاح

مدرسے میں مختلف کلاسز کے دوران آتے جاتے جہاں موقع ملتا وہ محراب عبدالکریم کا رستہ روک کر کھڑا ہو جاتا اور اسے اوجھسے جھکنڈوں سے پریشان کرتا شروع شروع میں اس نے برداشت کیا مگر بات جب حد سے بڑھ گئی تو بہت سوچنے کے بعد اس نے بلا خراپنی ماں اور عباد کو سب بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ مریم بیگم کے علم میں بات آئی تو انہوں نے فوری اسے مدرسہ چھوڑنے کا فیصلہ سنایا مگر عباد نے ایسا نہیں کیا۔

مغرب کی زبانی اسے پتا چل گیا تھا کہ مدرسے والے کبھی بھی اس لڑکے کے خلاف ایکشن نہیں لیں گے لہذا اس نے اپنے طور پر اسے سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا، اس روز موسمِ قدرے ابرا آلود تھا۔ عباد نے اپنے طور پر اس کے معمولات چیک کیے اور مدرسے جاتے ہوئے راستے سے ہی اسے کن پوائنٹ پر انقواء کر لیا۔ حویلی میں کسی کو بھی اس کے معمولات کی خبر نہیں تھی۔ راستہ سنسان تھا لہذا تھوڑی سی ڈرائیو کے بعد اس نے سڑک کے کنارے گاڑی روک دی تھی۔

”باہر آؤ.....“ اگلے ہی پل گن پوائنٹ پر اس نے
اے گاڑی سے باہر گھسنا تھا۔ لڑکا قدرے حیران چپ
چاپ گاڑی سے باہر نکل آیا۔

”بھائی جہاں تک میرا خیال ہے میں تو آپ کو جانتا
تک نہیں پھر مجھے کس جرم کی سزا دے رہے ہیں آپ؟“
گاڑی سے باہر نکلتے ہی اس نے پوچھا۔ جب عباد نے
اس کے چہرے پر زوردار پھیر سید کیا۔

"سزا کے بچے..... شکل مومنانِ کربلا کا فراموش کرنا
شاید جاننے نہیں کس جگہ پکا لیا ہے تم نے۔"

”بھائی مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا آپ کیا کہہ رہے ہیں“

”بے شک امی..... اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“
 ستر جھکاتے ہوئے اس نے دل سے دعا کی مگر وقت کا
 بے رحم دیوتا اس کی دعا پر طنزیہ قہقہے لگاتا کچھ اور ہی پلان
 کر رہا تھا۔

لال حویلی میں بیڑوں کی باہمی مشاورت سے بالآخر عباد اور محراب کا نکاح طے کر دیا گیا تھا۔ نایاب عبدالکریم کی ناگہانی موت کے پورے پانچ ماہ بعد اس حویلی میں سب خوش تھے، ایک بیٹی کی قربانی کے بعد مریم بیگم کو لگا ان کی دوسری بیٹی کی زندگی محفوظ ہوگئی ہے۔ محراب عبدالکریم کے پاؤں تو گویا زمین پر ہی نہیں ٹک رہے تھے، خوشی ہی ایسی تھی کہ وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔ زارون عبدالرحیم اب زیادہ تر حویلی کی بجائے باہر زمینوں پر وقت گزارتا تھا۔ حویلی میں عباد اور محراب کے نکاح سے جیسے اسے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا تھا۔ عباد جو اس سے اچھا خاصا متنفر ہو چکا تھا اب مطمئن ہو گیا تھا۔

مخرب کا شہر کے سب سے بڑے مدرسے میں داخلہ
 بھی ہو گیا تھا۔ زندگی سبک روی سے پھر رواں دواں ہو گئی
 تھی۔

لال حویلی کی اونچی دیواروں نے بلا خرمیاد اور محراب کے نکاح کی خوشی بھی دیکھی اور اس دوران جتنی بار بھی محراب کا زارون سے سامنا ہوا وہ اسے سنجیدہ اور خاموش ہی دکھائی دیا تھا۔ ایک خوف جو ہمہ وقت اس کے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا نکاح کے بعد جاتا رہا تھا۔

عبداللطیف کے نکاح میں آنے کے بعد وہ ویسے بھی خود کو بہت مضبوط محسوس کرنے لگی تھی۔ زارون کی ایبروڈ کے لیے ٹکٹ کنفرم ہو گئی تو دل میں جو رہے ہے سو سے تھے وہ بھی خود بخود ختم ہو گئے تھے۔ زارون باہر چلا گیا، عہدے زبانی سنجال لیں، حویلی میں ان کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی مگر انہی دنوں عجیب معاملہ ہوا کہ مہراب

شام میں محراب کی در سے سے واپسی کے بعد اس نے اسے چھت پر بلا لیا تھا۔

دونوں سردار اس وقت ڈیرے پر تھے جبکہ حویلی کی بیگمات روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھیں۔ محراب دھڑکتے دل کے ساتھ موقع دیکھ کر چھت پر چلی آئی تھی۔ عباد چارپائی پر جت لیٹا، ایک ٹانگ موڑ کر دونوں بازو سر کے نیچے دھرے تاروں بھرے آسمان کو دیکھ رہا تھا، اس کے چھت پاتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”آؤ بیٹھو..... تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

”خیریت.....؟“ وہ قدرے پریشان تھی، عباد نے لگا ہوا اس کے صبح چہرے پر جمادیں۔

”کچھ بات کرنی تھی۔“

”جی کہیں؟“ دونوں ہاتھ گود میں دھرے وہ اس کے پہلو میں ٹک گئی تھی۔ عباد نے اس کے دونوں ہاتھوں پر اپنا بھاری مضبوط ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”میں چاہتا ہوں محراب..... اسی مہینے ہماری شادی ہو جائے، ابو اور تایا ابو کو یقیناً کوئی اعتراض نہیں ہوگا، تم کیا چاہتی ہو؟“ وہ اس کی رائے لے رہا تھا، محراب کی چٹکیں جھٹک گئی تھیں۔

”ہماری شادی تو طے ہے پھر یوں اچانک جلدی کی وجہ؟“

”کچھ خاص نہیں بس مکمل طور پر اپنی دسترس میں دیکھنا چاہتا ہوں تمہیں۔“

”کیا آپ کو کوئی خوف لاحق ہے؟“

”نہیں۔“

”تو پھر جلدی کر کے سب کی نظروں میں ہمارے تعلق کو مشکوک کرنے کی کوشش مت کریں۔“ وہ کسی اور خیال سے کہہ رہی تھی، عباد نے اسے کسی اور خیال سے لیا تھا۔

”ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔“

”اس لڑکے کا کیا بنا..... سبق سکھایا آپ نے اسے؟“ عباد کے گہری سانس بھر کر نظر پھیر لینے پر وہ موضوع

بدلتے ہوئے بولی تھی۔ جواب میں عباد نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے ہٹا لیا تھا۔

”ہوں.....“

”اب تو پریشان نہیں کرے گا ناں وہ مجھے؟“

”نہیں..... لیکن بہتر ہے تم رخصتی تک مدرسے نہ جاؤ۔“

”کیوں؟“ وہ پریشان ہوئی تھی، عباد نے نظریں پھر اس کے چہرے پر جمائیں۔

”میں کہہ رہا ہوں کیا یہ کافی نہیں ہے۔“

”کافی ہے مگر یوں اچانک.....“

”بس..... میں نہیں چاہتا اس لڑکے کے بعد پھر کوئی اور تمہیں تنگ کرے اور میں اپنے سارے ضروری کام

چھوڑ کر اس سے دشمنی مول لیتا پھروں۔“

”ٹھیک ہے کل میں مدرسے والوں کو کہتاؤں گی میں نہیں آسکتی۔“

”ہوں.....“

”اب جاؤں؟“

”ہاں جاؤ..... میں تھوڑی دیر آ رام کروں گا اب۔“ وہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ تھوڑی دیر تیار ہونا چاہتا ہے مگر اس نے اسے کسی الجھن میں ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ محراب قدرے پریشان ہی اس کے پہلو سے اٹھ کر بیڑیوں کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز محراب کو مدرسے چھوڑنے کے بعد وہ سیدھا

ڈیرے پر آیا تھا۔ سردار عبدالرحیم اور سردار عبداللطیف اس

وقت وہیں موجود تھے عباد نے بڑے طریقے کے ساتھ

اپنی جلد شادی کی خواہش ان کے سامنے رکھ دی تھی۔ وہ

نہیں چاہتا تھا کہ محراب کے ساتھ اس کا رشتہ کسی بھی

آزمائش کی بھیئت چڑھے، ایک طرح سے اسے محراب

عبدالکریم پر اندھا یقین تھا۔ سردار عبدالرحیم نے اس کی

خواہش حامی بھر لی تھی۔ زارون اس وقت پاکستان نہیں

آسکتا تھا۔ دو ماہ بعد اس کی ہونے والی شادی دو ہفتے بعد

عبدالکریم کی اس حویلی میں ناگہانی موت کے ٹھیک سات ماہ بعد وہاں محراب عبدالکریم کی قبرت خاک موت کا فرمان جاری کر دیا گیا تھا۔ اس کی پیدائش نایاب کی پیدائش سے ٹھیک سات ماہ بعد ہوئی تھی اور اب اس کی موت کا فرمان بھی اس کی موت کے ٹھیک سات ماہ بعد طے ہو گیا تھا۔ پورے سات ماہ بعد اس حویلی میں اترنے والی وہ ایک خون آشام ہات تھی۔

طویل سفر کے بعد جس وقت محراب کو ہوش آیا شام
 ڈال رہی تھی۔ وہ اپنی جواسے بے ہوش کرتے وقت اس
 کی آنکھوں پر باندھی گئی تھی اب نہیں تھی، آنکھیں مسلتے
 ہوئے اس نے ارد گرد دیکھا وہ ایک بے حد خوب صورت
 ڈیکورڈ گھر تھا۔ نیا بنا ہوا، سجا سجا یا خوب صورت گھر۔
 اسے یاد آیا جب وہ مدرسے سے اپنی دوست غزالہ کی
 اطلاع پر کہ اس کا کزن عباد کسی ایمر جنسی میں باہر اسے
 لے آئے ہیں، کلاس انچارج کو بتا کر نکلی تھی تو دن تھا۔ دل
 میں ہر اٹھاتے مختلف دوسروں کو روندتی، وہ سڑک پر بالکل
 عباد جیسی گاڑی دیکھ کر مطمئن ہو گئی تھی۔ اس کے وہم
 و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ آنے والے اگلے
 چند لمحوں میں کیا ہونے والا ہے؟

گھاڑی میں اس کے بٹھتے ہی کسی نے اس کے منہ پر
 ہاتھ رکھا تھا، ساتھ ہی اس کی آنکھوں پر پٹیا باندھ دی گئی
 تھی، مجرب سمجھ ہی نہ سکی کہ اچانک اس کے ساتھ کیا ہو گیا
 ہے؟ اس کا سر تیزی سے پھرایا اور اگلے کچھ ہی لمحوں میں
 وہ ہوش و حواس سے بر گمانہ ہو گئی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ
 اسے بے ہوش ہوئے کتنا وقت گزرا، تاہم وہ اتنا ضرور
 جان گئی تھی کہ اس کے ساتھ وہ انہونی ہو چکی ہے جس کا
 اسے ڈر رہتا تھا، لال حویلی کے بندر دو یوار اور مکین اب
 اس پر حرام ہو چکے تھے۔

دل تھا کہ گویا پسلیوں میں ہی دم توڑ گیا تھا، جبکہ

ہوں۔ اسے ہوش میں آئے ابھی کچھ ہی وقت گزرا تھا

ہوتا طے پاگئی تھی۔ عباد نے طے کر لیا تھا وہ بنا محراب سے کوئی وضاحت لیے، پورے خلوص کے ساتھ اسے اپنی زندگی میں شامل کرے گا۔

ڈیرے سے حویلی واپسی پر اس نے حویلی کی خواتین کو بھی یہ خوش خبری سنا دی تھی۔ اب اسے شام کا انتظار تھا، مدرسے سے محراب عبدالکریم کی واپسی پر وہ اسے یہ سر پر اندر دینا چاہتا تھا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ محراب عبدالکریم اس روز مدرسے سے واپس ہی نہیں آئی تھی۔ مدرسے والوں کے بقول وہ کسی ضروری کام کا عذر پیش کر کے چھٹی سے پہلے ہی مدرسے سے رخصت ہو گئی تھی۔ پاؤں تلے زمین ٹکنا اور سر پر آسمان گرنا کسے کہتے ہیں عباد عبداللطیف کو اس لمحے پتا چلا تھا۔ ابھی کل ہی تو اس نے سے مدرسہ چھوڑنے کا کہا تھا اور آج وہ غائب ہو گئی تھی..... کیوں؟ اس نے تو کہیں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی، صبح اسے مدرسے کی محفوظ عمارت میں اتار کر شام میں وہ خود اسے اسی محفوظ پناہ گاہ سے پک کرتا تھا پھر وہ جھوٹ بول کر کہیں غائب کیوں ہوئی تھی؟

کسی ہتھوڑے کی طرح یہ ”کیوں“ اس کے دماغ کو توڑ پھوڑ رہا تھا۔ شام ڈھل رہی تھی مگر وہ حویلی واپس جانے کے بجائے شہر کی ایک ایک سڑک ایک ایک چپہ چپہاں رہا تھا۔ وہ گھر جہاں اس نے اس روز اسے کسی لڑکی کے ساتھ چاتے دیکھا تھا اسے بھی تالا لگا ہوا تھا۔ درے کے سی ای سی وی کیسرے میں اسے واضح درے کے گیٹ سے اکیلے نکل کر کچھ ہی فاصلے پر کھڑی ایک سفید رنگ کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا جاسکتا تھا۔ کوئی قیامت تھی جو اس شام عبداللطیف کے دل پر ڈھے گئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا وہ غم و غصے میں ساری دنیا کو ہنس نہ سکرے۔ لال حویلی کی بے رحم بلند دیواروں تک رات گئے محراب عبدالکریم کے بھاگنے کی خبر پہنچ گئی تھی۔

مریم بیگم تو یہ سنتے ہی بے ہوش ہو گئی تھیں جبکہ حویلی کی دیگر خواتین پر جیسے مسکتہ طاری ہو گیا تھا۔ نایاب

وہ یا تا ب جو اس سے پورے سات ماہ بڑی تھی، جو اس سے زیادہ ذہین، حویلی میں اس سے زیادہ جیتی، زیادہ سمجھدار تھی، مگر زارون عبدالرحیم نے اسے ہرا دیا تھا، اس کی پاکیزگی جس کی کو ایسی پورا علاقہ دیتا تھا پھر بھی اسے موت کی مزاملی تھی۔ بچپن سے جوانی تک اس کے گزرے ایک ایک ہل کے گواہ اس کے اپنے رشتوں نے اس پر بدکرداری کی مہر لگا دی تھی۔ زارون عبدالرحیم نے خود کو کچھ رکھنے کے لیے اسے سب کی نظروں میں غلط ثابت کر دیا تھا تا ب وہ اس کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا تا ب جبکہ وہ عباد عبداللطیف کی منکوحہ تھی۔ خوف سے اس کا چہرہ زرو بڑ گیا تھا تا ب ہی اس نے زارون کو کہتے سنا۔

”کیا ہوا..... ڈر گئی مجھ سے، ارے پاگل بتایا تو تھا تمہیں..... تم حوصلے کے کسی مرد کی گولی کا نشانہ بنو گی، تمہیں میں اپنی زندگی کا حصہ بناؤ گا ٹرسٹی۔“ اس نے اس شخص کے چہرے پر عجیب سی چمک تھی۔ محراب نے ہارے ہوئے انداز میں سر گھٹنوں میں نکا دیا..... اس کے دل کی بے چینی اور وہم غلط ثابت نہیں ہوا تھا، زارون عبدالمکریم اس کی زندگی میں جیسا لے لے رہا تھا۔

جب درد پرانے ہو بیٹھے

جب یاد کا جگنورا کہہ ہوا

جب آنکھ میں آنسو پڑے ہوئے

جب زخم سے دل زلزلہ ہوں

جب کمرے کا دروازہ ہلکی سی آہٹ کے ساتھ کھلا اور اگلے ہی لمحے زارون عبد الرحیم چہرے پر ہلکی سی فخریہ مسکراہٹ سجائے اس کے مقابل چلا آیا تھا۔ مخراب کی آنکھیں اسے دیکھ کر پھٹی کی پھٹی روئی تھیں۔

”تم...؟“ اسے جیسے اپنی مچاکی پر شک ہو گیا تھا۔
جواب میں زارون کے لبوں کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی تھی۔

”ہاں میں..... کیوں اور بھی کسی مرد کے ساتھ کوئی دشمنی ہے کیا تمہاری؟“ اس کے بالکل قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے اس کے گالوں کو چھوا وہ ہراساں سی ہلک کر رہ گئی۔

”نہیں۔۔۔ تم اتنا نہیں گر سکتے، اپنی سلی چچا زاد کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو؟“ اسے ابھی تک اپنی بصارت پر یقین نہیں تھا۔ زارون مزے سے مسکراتے ہوئے زمین پر اس کے پہلو میں ساتھ چپک کر بیٹھ گیا تھا۔

”تمہیں کیا لگا..... اتنی آسانی سے میں تمہیں مسرہواؤ
ہونے دوں گا؟ ارے پاگل..... ایک تمہیں نہ کھونے کے
لیے تو تمہاری سگی بہن اور اپنی سگی چچا زاد کزن کے کمرے
میں آدھی رات کو، اپنا دوست گھسا کر اسے بے موت مروایا
اور تم نے سمجھ لیا، میں یوں آسانی سے نہایت شرافت کے
ساتھ تمہیں کسی اور کے ساتھ زندگی گزارتے دیکھ لوں گا
نہیں محراب اتنا بڑا دل اور ظرف نہیں ہے میرا۔“ کہنے
کے ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ اس کے دونوں کندھوں کے
گرد پھیلادیا، محراب کو لگا جیسے اس کا وجود یہ کسی نے بم
سے بلاسٹ کر دیا ہو۔ اس میں اتنی سی ہمت بھی نہیں رہی
تھی کہ وہ اپنے کندھوں کے گرد سے اس کا بازو جھٹک
دیتی۔ دل کا وہ ہم بچ بن کر سامنے گیا تھا۔

بے ساختہ اس کو اپنی ماں کا خوشی سے دھمکتا چہرہ یاد آیا، وہ کتنی مسرور اور مطمئن تھیں کہ زارون اب روڈ چلا گیا ہے اب ان کی بیٹی کی زندگی میں کوئی پریشانی نہیں آئے گی۔ خوشی سے دھمکتا وہ چہرہ درے سے اس کے غائب ہو جانے کی خبر پر دکھ سے کیسے سفید پڑا ہوگا وہ واضح محسوس

تیار مگر پھر بھی یہ تلخ حقیقت اسے برداشت کرنی پڑ رہی تھی۔ محراب کی دوست غزالہ نے، ہامشکل اس سے رابطہ کر کے اس تک محراب کی سینڈ رائٹنگ میں لکھا اس کا خط پہنچایا تھا اور یہی وہ خط تھا جس کے بعد اس نے اسے طلاق دے کر اس کا فیصلہ حویلی کے سرداروں کے سپرد کر دیا تھا۔ محراب نے لکھا تھا۔

”السلام علیکم عباد!“

میں جانتی ہوں آپ مجھ سے بہت غلط ہیں، سچا پیارا بھی کرتے ہیں مگر میں معافی چاہتی ہوں میں چاہتے ہوئے بھی آپ کا ساتھ نہیں دے سکتی، مجھے نفرت ہے لال حویلی کی روایات سے، جس دن اس حویلی کے سرداروں نے میری بے قصور بہن کو موت کی گہری خیند سلایا اسی روز میں نے یہ قسم کھائی کہ میں ان سرداروں سے اپنی بہن کی موت کا بدلہ ضرور لوں گی؟ جس الزام میں ان ظالم بے حس مردوں نے میری بہن کو موت دی وہ الزام حقیقت بنا کر ان کے مکروہ چہروں پر کا لک ضرور ملوں گی، مجھے معاف کرو یا عباد، میں نے آپ کا استعمال کیا کیونکہ زارون بہت ہوشیار نکلا وہ میرے قابو میں نہیں آیا، اب علاقے کے لوگوں کو بتانا، نایاب عبدالکریم کی بہن مخراب عبدالکریم نے کیا کیا ہے؟ ہو سکے تو میری ماں کو میرے گناہ کی سزا امت دینا کیونکہ وہ بے قصور ہیں۔

فقط ایک باغی

محراب عبدالکریم

جتنی بار اس نے یہ خط پڑھا تھا اس کے اندر نئے سرے سے توڑ پھوڑ ہوتی تھی، گنتی بار وہ ٹوٹ کر بکھرا تھا، رویا تھا۔ حویلی کے سرداروں نے جس وقت محراب عبدالکریم کی موت کا فیصلہ سنایا وہ یوں ساکت بیٹھا تھا گویا تن مردہ میں جان ہی نہ ہو۔ گویا محراب عبدالکریم کی موت سے اسے کوئی لینا دینا ہی نہ ہو۔ مریم بیگم خود زندہ لاش بن کر رہ گئی تھیں، کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا جب ان کی آنکھیں خشک ہوتی ہوں۔

ایک بیٹی کی المناک موت کے بعد دوسری بیٹی کو

جب دل کو دھڑکنایا دیا
جب کرب کی لمبی راہوں میں احساس کے پال سفید
ہوئے

جب آنکھیں بے سیلاب ہوئیں
جب چند چڑھایے دردی کا
جب ریت پہ لکھی یادوں کو بے مہر ہوانے چھین لیا
جب یاد تیں بیدار ہوئیں
تب مجھ پہ کھلا میں زندہ ہوں
تب دل کو دھڑکنایا آیا
پھر وقت نے کچھ گھڑائی لی
پھر سوچ کی قبر سے دخول اڑی
پھر یہاں کا برزخ بھول گیا

اک ہجر سے کیا آزاد ہوئے سو ہجر نے ایجاد ہوئے
پھر اشک میں دریا قید ہوا
پھر دھڑکن میں بھونچال پڑے
پھر عشق کا جوگی گلیوں میں
نقدیر کا سانپ اٹھالایا
پھر عشق کا جنگل سبز ہوا پھر زلف کے تیور شام ہوئے
اس شام میں پھر ماہتاب چڑھا
پھر ہونٹ کی لرزش گیت بنی
پھر دروازے لختا بن بیٹھا
پھر کرب کا قرب جو ان ہوا
پھر مجھ پہ کھلا میں زندہ ہوں
پھر دل کو دھڑکنایا آیا

لال جوہلی کی اوپنی دیواروں میں محراب عبدالکریم کے
انوا کا وہ دوسرا دن تھا جو سوگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ عباد نے
بے حد خاموشی کے ساتھ اسے طلاق دے دی تھی۔ پچھلے
چوبیس گھنٹوں میں سگریٹ کے نجانے کتنے پیکٹ اس
نے پھونک ڈالے تھے۔ دل پر جو لگا تھا بڑا گہرا دار تھا۔
محراب عبدالکریم اس کے ساتھ جھوٹ بول سکتی ہے،
دھوکہ دے سکتی ہے، اس نے تو اس بات کا تصور بھی نہیں کیا

کے اہلیک سے کمرے میں اس وقت سردار عبدالرحیم کی غصیلی آواز گونج رہی تھی۔ وہ جیسے جیسے سختی گئی اس کا وجود بے جان ہوتا گیا۔ واپسی کے سارے دروازے بند ہو گئے تھے۔ زندگی کے سارے دروازے بھی بند ہو گئے تھے، زارون نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھ دیئے تھے۔

”آگیا یقین..... چلو اب میں تمہیں بتاتا ہوں، یہ سب ہوا کیسے؟ اصل میں تم نے بھی وہی نایاب والی غلطی کی، میرے منہ پر مجھے رو کر دیا، صرف رو نہیں وارن بھی کر دیا، ذرا سوچو کیسے تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ سکتا تھا، بہت سوچا کیا ایسا کروں کہ تم خود رو رو کے مجھ سے میری رفاقت مانگو، سوائے میرے اور کوئی تمہارا حق دار نہ ہو، بہت سوچ سوچ کے یہی حل سمجھ میں آیا کہ تم سے تمہاری پاکیزگی چھین لوں، یہ سب آسان نہیں تھا اس لیے مجھے پوری پلاننگ کرنی پڑی، بالکل ویسی ہی پلاننگ جیسی نایاب کے لیے کی تھی، لہذا تمہارے کیس میں بھی وہی دوست کا مآپا جیسا آدھی رات کو نایاب کے کمرے میں کھوا کر اس پر اس کی بدکرداری ثابت کی، پہلے داڑھی رکھوائی، پھر اسے اسی مدرسے میں سفارش کر کے بلا معاوضہ ملازمت پر لگوا دیا جہاں پاپا نے تمہارے داخلے کی اجازت دی تھی، صرف میری دوستی میں اس نے شرافت کا چوڑا پیمانہ کر مدرسے کی سادہ لوح انتظامیہ کا اعتماد دیتا لیکن صرف اس کا کردار کافی نہیں تھا، اس لیے اس کے ساتھ ساتھ فزکال کی مدد لینی پڑی، فزکال کو تو جانتی ہوتاں تم..... تمہاری دوست، وہی دوست جو تم سے اور مدرسے والوں سے جھوٹ بول کر صرف میرے حکم پر تمہیں اپنی بیماریاں کی جھوٹی کہانی سنا کر، بیوقوف بنا کر، اپنے گھر لے جاتی رہی اور تمہارے سامنے اپنی معذور ملازمت کو اپنی ماں بنا کر تمہاری ہمدردی حاصل کرتی رہی۔ تمہارے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی کہ میں نے یہ سب کیوں کیا؟ چلو بتا دیتا ہوں کیا یاد کرو گی تم بھی کہ کیسے سچے کھرے انسان سے الٹا ہوا تھا تمہارا، ڈیڑھ محراب عبدالکریم میں نے یہ سب

کھونے کی ہمت ہی نہیں تھی ان کے اندر، جب ہی ہمہ وقت چائے نماز پر بیٹھی وہ بس ایک ہی دعا کرتی تھی کہ مہربان زندگی میں بھی لوٹ کر حویلی نہ آئے۔ سردار عبدالرحیم نے زارون کو کال کر کے حویلی کے تازہ حالات بتا دیے تھے اور اس نے ان سے درخواست کی تھی کہ جب تک وہ امریکہ سے واپس نہیں آتا مہربان عبدالکریم کی سزا پر عمل دیا نہ کیا جائے۔ پورے چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد حویلی میں سب سے بات کر کے وہ مہربان کے پاس آیا تھا جو پچھلے چوبیس گھنٹے سے بھوکی پیاسی بیٹھی بس روری تھی۔

”ایک خوش خبری ہے تمہارے لیے۔“ مسکراتی نگاہوں سے اس کا مڑبھاپا چہرہ دیکھتے ہوئے وہ اس کے قریب ہی لٹک گیا تھا، وہ پتھر کی صورت بنی بیٹھی رہی تھی۔

”پوچھو گی نہیں کیا خوش خبری ہے؟“ اس وقت محراب کی حالت اسے لطف دے رہی تھی، وہ چپ رہی تھی۔

”چلو میں خود ہی بتا دیتا ہوں، تمہارے عہد اور عبد اللطیف صاحب نے طلاق دے دی ہے تمہیں اور اس کے طلاق دینے کے بعد حویلی کے سرداروں نے تمہاری بہن کی طرح تمہارے لیے بھی موت کی سزا طے کر دی ہے، آسان لغتوں میں اب اگر تم حویلی جانی ہو تو تمہاری زندگی کی کوئی گارنٹی نہیں، اب بتاؤ آگے کیا پلاننگ ہے تمہاری؟“ وہ اتنا مطمئن اور مسرور تھا کہ محراب پر سے آنسوؤں کے ساتھ حیرانی سے اسے فقط دیکھتی رہ گئی تھی۔ کسی انسان کا ایسا گھٹا ہوا، شیطانی روپ بھی ہو سکتا ہے، اسے آنکھوں دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

”کیا ہوا۔۔۔ یقین نہیں آ رہا۔۔۔ اور یکارڈنگ سن لو، مجھے پتا تھا تمہیں یقین نہیں آئے گا اسی لیے کال ریکارڈ کر لی، اب بھی حوصلے پات ہوئی ہے جو تنازعہ حالات ہیں وہاں کے وہی بتا رہا ہوں تمہیں۔“

اسے خاموش دیکھ کر وہ پھر مسکرایا۔ محراب کے برستے
آنسوؤں میں مزید شدت آگئی تھی۔ کتنا آسان تھا اس
لفظ کے لیے کسی کی بھی زندگی کو اوجھڑ کر رکھ دینا۔ موبائل

”کتنی بھولی ہوناں تم بھی بلکہ نہیں تم تو یہوقوف ہو، میں نے کہا میں عباد عبداللطیف کے حق میں دستبردار ہو رہا ہوں اور تم نے یقین کر لیا، اچھی طرح مجھ سے واقف ہونے کے باوجود یقین کر لیا تم نے، کتنی حیران کن بات ہے ناں۔“ اس بار اس نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لیا تھا۔ محراب نے نفرت سے منہ پھیر لیا تھا۔

”اچھا..... پھر دھمکی دے دی ہو مجھے؟“

”وہمکنی نہیں بدو عا دے رہی ہوں۔“

"ہاہاہاہاہا..... چیونٹی ہو تم محراب عبدالکریم، میرے سامنے چیونٹی جتنی حیثیت بھی نہیں تمہاری، بے فکر رہو، تمہاری بددعائیں مجھ پر کوئی اثر نہیں کرنے والیں۔" وہ اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ محراب بیورنگ آنکھوں سے اسے دیکھتی صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئی تھی۔

محراب عبدالکریم کے انوار کا وہ تیسرا دن تھا جب زارون نے اسے بے ہوشی کی حالت میں حوٹلی سے قدرے فاصلے پر پھینک دیا تھا۔ شام ڈھل رہی تھی۔ دن بھر کے تھکے ہارے پرندے اپنی اپنی چونچ میں بچوں کا رزق سمیٹ کر افق کے اس پار ڈوبتے سورج کی تاریکی کرنوں کے ساتھ ساتھ اپنے گھونسلوں کو واپس پلٹ رہے

تھے..... جب ہی حویلی کے ایک ملازم کی نگاہ اس پر پڑی تھی۔

جگہ جگہ سے پھنٹے ہوئے کپڑوں میں ملبوس، وہ حویلی سے چند قدم کے فاصلے پر اونٹن سے بے ہوش پڑی تھی۔ ملازم کی نظر جیسے ہی اس پر پڑی اس نے فوراً حویلی اطلاع کر دی تھی۔ ایک قیامت اس حویلی پر تین روز پہلے ٹوٹی تھی جب وہ اغوا ہوئی تھی اور ایک قہر آب ٹوٹا تھا جب وہ واپس آ گئی تھی۔ مریم بیگم کا رورور کر برا حال تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کی بیٹی گناہ گار نہیں ہے مگر وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ اس کے باوجود اسے اس حویلی میں بے موت مار دیا جائے گا۔ حویلی کے چکھوڑے میں بے گور و کفن دفن ہونے والی اس بدنصیب حویلی کی بدنصیب خواتین میں ایک اور اضافہ ہو جائے گا۔

بار بار وہ بے ہوش ہو جاتی اور بار بار انہیں ہوش میں لایا جاتا تھا۔ عباد کو جب سے اس کی واپسی کی اطلاع ملی تھی وہ اسی وقت گاڑی لے کر حویلی سے نکل گیا تھا۔ سردار عبداللطیف بھٹہ تھے کہ جو خطا محراب سے ہوئی ہے اس میں کسی طور معافی کی کوئی گنجائش نہیں لہذا جتنی جلدی ہو سکے محراب کی سزا پر عمل کیا جائے مگر سردار عبدالرحیم رارون کی وجہ سے معاملہ لڑکا رہے تھے۔ مریم بیگم جب بھی ہوش میں آتیں باری باری دونوں سرداروں کے پاؤں پکڑ کر ان سے اپنی بیٹی کی زندگی کی بھیک مانگتیں مگر یہاں ان کی التجائیں کوئی اثر دکھانے والی نہیں تھیں۔

محراب عبدالکریم کو رعایت دینے کا مطلب تھا حویلی کی دیگر لڑکیوں کو غلط راستے پر آگے بڑھنے کا حوصلہ دینا اور یہ وہ کسی صورت گوارہ نہیں کر سکتے تھے، تب ہی سردار عبدالرحیم نے زارون پر واضح کر دیا تھا کہ وہ جلد از جلد حویلی پہنچے تاکہ محراب کو دی جانے والی سزا پر عمل کیا جاسکے۔ زارون نے حامی بھری تھی اور اب وہ حویلی میں موجود تھا۔ پتھر کی صورت بنی محراب کو مریم بیگم نے جی بھر کر چنایا، اگر زیب بیگم انہیں نہ سنبھالتیں تو شاید وہ اس کی

”وزن ہوتا ہو میں اس سے متفق نہیں ہوں..... سارا علاقہ ہم پر تھو تھو کر رہا ہے کہ ہماری حویلی کی لڑکیاں ایسی ہیں، خط نہیں پڑھا آپ نے اس کا، پیچھے کیا رہ جاتا ہے؟ اور پھر عباد طلاق دے چکا ہے کون اپنائے گا اب اسے؟ ساری زندگی کا لک کا نشان بن کر ہمارے سینے پر مونگ دیتی رہے گی۔“ بیٹے کی طرف داری کرنے پر سردار عبداللطیف نے سردار عبدالرحیم سے پہلی بار اختلاف کیا تھا۔ تب ہی زارون بولا۔

”اس نے چاہے جو بھی لکھا ہو مگر میں سردار عبدالرحیم کا بیٹا ہوں، میرا دل اور ظرف بہت بڑا ہے، کوئی کرے نہ کرے میں شادی کروں گا اس سے، دل کی پوری رضا مندی کے ساتھ۔“

کوئی بم تھا جو اس نے وہاں پھوڑا تھا۔ دونوں سردار ہکا بکا اس کا منہ دیکھتے رہ گئے تھے۔

”تم ہوش میں تو ہوزاروں؟“

"ہوش میں ہوں اسی لیے یہ بات کر رہا ہوں بابا۔۔۔۔۔ وہ اس حویلی کی بیٹی ہے، ہماری عزت ہے، آج جو لوگ ہم پر انگھیاں اٹھا رہے ہیں کل اس شادی کے بعد منہ چھپاتے پھریں گے، اس حویلی میں، میں مزید کوئی نئی قبر نہیں دیکھنا چاہتا بابا۔۔۔۔۔ مجھے وہ قبول ہے کیونکہ میں بچپن سے سچے دل کے ساتھ اسے پسند کرتا ہوں، میں مریم چچی کو بے موت مرتے نہیں دیکھ سکتا پلیز۔" اپنی پاننگ کے عین مطابق اس نے تراب کا آخری پتا پھینک دیا تھا۔ سردان خانے میں خاموشی چھا گئی تھی، مگر سنانے میں نئی خوف ناک خاموشی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ شمارے میں)



جان ہی لے لیتیں۔ بیٹی کی بے گناہی کا یقین ہونے کے باوجود انہیں اس پر غصہ تھا کہ وہ ان کے منع کرنے کے باوجود مدرسے کیوں گئی، اگر وہ ان کے حکم پر مدرسے جانا چھوڑ دیتی تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔

زارون سر دار عبدالرحیم اور سر دار عبداللطیف کے ساتھ
 بیٹھا تھا۔ سر دار عبداللطیف کہہ رہے تھے۔

”اس لڑکی نے اپنی بہن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پودے علاقے میں ہماری عزت خاک میں ملا دی ہے، میرا اور میرے بیٹے کا ظرف تھا کہ اس کی بہن کا گناہ بھلا کر ہم نے اسے عزت دی، نام دیا مگر اس نے کیا کیا، ہمیں ہی اپنے انتقام کی زد پر رکھ لیا، خط پڑھو اس کا، کیسے باغیانہ خیالات ہیں اس لوٹھی کے اپنے ہی بزرگوں کے خلاف، آج اسے معافی دینے کا مطلب ہے حویلی کی روایات کے خلاف جانا، نئی آنے والی چیزھی کے لیے خود برائی کی راہ ہموار کرنا اور ایسا میں کسی صورت نہیں ہونے دوں گا۔“ ان کے بیٹے کا دل ٹوٹا تھا لہذا ان کا غصہ جائز تھا۔ زارون نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

”میں مانتا ہوں جاچا سائیں کہ آپ کی ہر بات بالکل درست ہے، مگر یہ بھی تو دیکھیں مریم چچی کس حال میں ہیں، ابھی سات ماہ پہلے ان کی ایک جواں سالہ بیٹی اسی حویلی میں کاروکاری ہوئی ہے، وہ کیسے یہ صدمہ برداشت کر رہی ہے؟“

”جیسے بھی کرے ہمیں پروا نہیں ہے، اپنی بیٹیوں کی پرورش میں جو کوتاہی اس سے ہوئی ہے اس کی سزا اسے ملنی چاہیے۔“

”نہیں چاچا سائیں..... ان کی ساری زندگی ہمارے سامنے ہے، اپنی بیٹیوں کی پرورش میں ان سے کہیں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی، یقیناً معاملہ کچھ اور ہے، میں مخراب کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں وہ ایسی لڑکی نہیں ہے، پلیز مجھے اپنے طور پر اس معاملے کو دیکھنے دیں، یہ نہ ہو روز قیامت عبدالکریم چاچا ہمارا گریبان پکڑ کر کھڑے ہوں۔“

”زارون کی بات میں وزن ہے عبداللطیف۔“

نازیہ کنول نازی
عشق کا گھر

دل جل رہا تھا غم سے مگر نغمہ گر رہا
digest novels lovers group
صبح سحر کی رات تھی تارے تھے اور ہوا
سایہ سا ایک دیر تلک بام پر رہا

اسلام علیکم دوستو
آنچل کے پلیٹ فارم پر ایک طویل مدت کے بعد
آپ سے مخاطب ہوں امید کرتی ہوں آپ سب بالکل
بخیر و عافیت ہوں گے "وہ جو عشق تھا" ایک طویل مدت
کے بعد آنچل کے لیے میرا ناول ہے
بے شک یہ ناول روایتی انداز میں لکھا گیا ہے مگر یہ
صرف روایتی ناول نہیں ہے اس ناول کے اندر آپ کو اس
معاشرے کی حقیقت بھی ملے گی ذہن کو فریش کرنے کا
ایندھن بھی ملے گا اور بہت سی معلومات بھی حاصل
ہوں گی۔ کیونکہ ایک طویل عرصہ کے بعد آنچل کی محبت
میں آپ سب دوستوں کے لیے بہت مصروف زندگی میں
سے وقت نکال کر بہت محبت سے یہ ناول آپ کے لیے
لکھا ہے۔

آپ کی پسندیدگی کے گراف پر یہ دل کس لیول تک
رہا پٹی سائے سے نوازا تاہر گزرتا ہوا لمحہ اس کی ہر قطر پر
مجھے آپ کے قیمتی الفاظ کا انتظار رہے گا۔ اسی کے ساتھ
آنچل سے وابستہ آپ سب قاری بہنوں سے شکریہ
ہے کہ پلیز آنچل کے ساتھ جڑے رہیں اور آپ کی وہ
دوست اور رشتہ دار جو آنچل کے بارے میں نہیں جانتے
جھیل کی اجاسی پر
بہوٹی کی طفل پر
بے خبر سے منظر میں
دو کے سمندر میں

☆.....☆.....☆

”کیسی لڑکی ہو تم محراب عبدالکریم..... میرے بیٹے نے سالوں پرانی حویلی کی روایت توڑ کر تمہیں موت کے منہ سے نکال لیا اور تم ہو کہ ابھی بھی اپنی ضد پراڑی ہو کیا چاہتی ہو تم؟ اس حویلی میں کوئی سکون کا سانس نہ لے۔“ وہ شکوہ کنال تھیں۔ محراب کے لبوں پر استہزائی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ بولی تو اس کے لہجے میں ٹوٹے کاچ سی چھین تھی۔

”مجھے اس حال میں پہنچانے والا خود آپ کا بیٹا ہے بڑی امی..... نایاب کی بے تصور موت کا ذمہ دار بھی وہی ہے۔“

”سن رہی ہو مریم تمہاری بیٹی کیا کہہ رہی ہے حویلی کے سرداروں تک اگر یہ بات پہنچ گئی تو قیامت آجائے گی۔“

”آجائے قیامت..... مجھے اب کسی قیامت کا ڈر نہیں مگر میں چیخ چیخ کر ساری دنیا کو بتاؤں گی کہ آپ کے بیٹے نے میری زندگی برباد کی ہے بے گناہ ہوتے ہوئے بھی اس نے مجھے سب کی نظروں میں گناہ گار بنادیا..... کبھی بخشا نہیں جائے گا بڑی امی میری اور نایاب کی بددعائیں کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔“

”بس..... بہت ہو گیا زبان بند کر لو لڑکی..... نہیں تو چیل کوئے تمہاری بوٹیاں لوج کھائیں گے۔“ مارے غنیض و غضب کے بیگم عبدالرحیم کا وجود کاپٹنے لگا تھا۔ تب ہی ان کی بڑی بہن آگے بڑھی تھی۔

”آپ یہاں سے چلیں امی..... یہ لڑکی اس قابل ہے ہی نہیں کہ اس پر کوئی احسان کیا جائے۔“

”صحیح کہا..... ذرا سی شرم بھی ہوتی اس کے اندر تو دارون بھائی پر اتنا بڑا الزام لگنے سے پہلے سوہا سوہتی جو شخص سمندر پار میٹھا تھا اپنے گناہ کو اسی کے سر پر تھوپ رہی ہے یہ اور اسے دیکھو پھر بھی اس کی زندگی بچانے کے لیے حویلی میں سب سے لڑنا پھر رہا ہے۔“ چھوٹی بہو کیوں پیچھے رہتی۔ مریم بیگم نے ایک کڑی نگاہ اس کے جھکے سر پر ڈالی اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔

زیادہ یہ مسئلہ میرے لیے اہم ہے محراب کو ذہنی طور پر نئے رشتے میں بندھنے کے لیے ابھی وقت کی ضرورت ہے اور مجھے بھی..... لہذا میں نے سوچا ہے کہ میں شہر میں کوئی اچھی جگہ دیکھ کر وہاں گھر تعمیر کروانا ہوں..... جب تک وہ مکمل ہوگا ہم یہاں نکاح کی رسم کر کے محراب اور مریم چچی کو شہر شفٹ کر دیں گے اسی نکاح کے ساتھ ہم عباد کے لیے کوئی اچھی سی لڑکی ڈھونڈ کر اس کی شادی طے کر دیں گے علاقے کے لوگوں کے لیے یہ شادی محراب سے ان کی توجہ ہٹانے کا بہانہ ہوگی بعد میں جب لوگ اس مسئلے کو بھول جائیں گے مریم چچی اور محراب پھر سے حویلی کا حصہ بن جائیں گی۔“ اس نے سب کچھ پہلے ہی پلان کر کے رکھا تھا۔ سردار عبدالرحیم نے پرسوج انداز میں آہستہ سے سر ہلایا تھا۔

☆☆☆.....

لال حویلی میں نئی تاریخ رقم ہو رہی تھی۔ جس نے بھی سنا زارون محراب عبدالرحیم سے شادی کر رہا ہے اس نے دانتوں تلے انگلی دبالی۔ بھلا زارون عبدالرحیم کو لڑکیوں کی کمی تھی جو اس نے ایک بھاگی اور دھکاری ہوئی طلاق یافتہ لڑکی کو اپنے لیے چن لیا۔ مریم بیگم پر تو مانو غشی کی کیفیت طاری تھی۔ ان کی بیٹی آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئی تھی۔ ادھر محراب بے حال تھی۔

”امی مجھے زارون سے شادی نہیں کرنی اس سے بہتر ہے مجھے بھی نایاب کی طرح شب کے اندھیرے میں بے وردی سے مار دیا جائے۔“ جس وقت اسے نکاح کے لیے تیار کیا جا رہا تھا اس نے مریم بیگم کے ہاتھ پکڑ کر ان سے کہا تھا۔ جواب میں انہوں نے رکھ کر ایک پھٹرا اس کے بھیکے ہوئے گال پر جڑا تھا۔

”یا گل ہوئی ہو؟ منع کیا تھا تمہیں مدد سے مت جاؤ..... مگر تم نے اپنی مرضی کی نتیجہ دیکھ لیا ناں اس کا اب بھگتو مگر خدا کا واسطہ ہے تمہیں میری تربیت کا مزید تماشا مت بناؤ۔“ وہ خود اندسے چنچر تھیں۔ بیگم عبدالرحیم جو پاس ہی کھڑی تھیں ان کے شکستہ لہجے پر آگے بڑھیں۔

ان کے پیچھے ہی بیگم عبدالرحیم اور ان کی دونوں بہنیں بھی وہاں سے چلی گئی تھیں۔

بات دہائی گئی تھی ورنہ کچھ بعید نہیں تھا کہ حویلی واقعی طوفانوں کی زد میں آ جاتی۔ اسی شام مردان خانے میں علاقے کے مولوی صاحب کو بلا کر خاموشی سے زارون کا نکاح محراب عبدالکریم کے ساتھ پڑھا دیا گیا تھا۔ سردار عبدالرحیم اور ان کے بڑے دونوں بیٹوں کی کوشش تھی کہ فی الحال علاقے میں یہ بات کسی کو پتا نہ چلے اسی مقصد کے لیے انہوں نے مولوی صاحب کو بھی تاکید کر دی تھی کہ وہ یہ راز ابھی راز ہی رکھیں۔ سردار عبداللطیف البتہ اس نکاح سے کچھ خاص خوش نہیں تھے۔ عباد بچھے تین روز سے حویلی سے غائب تھا۔ محراب عبدالکریم کی بے وفائی کے باوجود اسے اپنی آنکھوں کے سامنے گولی کا نشانہ بننے ہوئے دیکھنا اس کی برداشت سے باہر تھا۔

☆☆☆.....

اس رات پورے تین دن حویلی سے غائب رہنے کے بعد وہ حویلی واپس لوٹا تھا رات کے بارہ بجے تھے مگر زینب بیگم جاگ رہی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھا پاؤں کو جوتوں کی قید سے آزاد کر رہا تھا جب وہ اس کے کمرے میں چلی آئی تھیں۔

”ارے امی جان آپ..... ابھی تک جاگ رہی ہیں؟“ ماں کو سامنے دیکھ کر وہ فوراً اٹھا تھا زینب بیگم اثبات میں سر ہلاتی اس کے بیڈ کے کونے پر ٹپک گئیں۔

”زارون اور محراب کا نکاح ہوا ہے ابھی..... کل صبح دونوں شہر چلے جائیں گے۔“ زینب بیگم کو خبر ہوتی کہ ان کی اطلاع ان کے لاڈلے اکلوتے بیٹے پر کیسی بجلی بن کر گرے گی تو شاید وہ بھی اسے یہ بات نہ بتاتیں۔ عباد کو لگا جیسے ایک ہی پہل میں کسی نے اس کا وجود ہم سے اڑا دیا ہو..... اگلے چند لمحوں تک اسے جیسے اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہیں آیا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں امی؟“ اعصاب قدرے بحال ہوئے تو وہ بولنے کے قابل ہوا۔ زینب بیگم اس کے

احساسات سے بے خبر سر جھکائے کہہ رہی تھیں۔

”تمہاری حیرانگی بجائے میرے بچے..... آج سے پہلے کبھی ایسا ہوا جنہیں مگر زارون نے ایسا کر دکھایا سب سے لڑا ہے وہ محراب کے لیے اور محراب کو دیکھو بجائے اس کا احسان ماننے کے وہ اپنے اغواء کا الزام اسی کے سر پر تھوپ رہی ہے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مردوں تک یہ بات نہیں پہنچی ورنہ شاید حویلی میں قیامت ہی آ جاتی۔“ وہ سادار دل خاتون تھیں اپنی سادگی میں جو مناسب لگا سب بتاتی گئیں۔ عباد کو لگا جیسے اس کا سانس سینے میں اٹک گیا ہوا ہے یا دایا محراب نے اسے بتایا تھا کہ نایاب کی ناگہانی موت زارون کی چال تھی..... اس نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ اسے پریشان کرتا ہے وہ اس سے خوف زدہ اور ہر اس سال تھی اس نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ بچپن سے زارون کی اس پر نظر تھی صرف اسے پانے کے لیے اس نے نایاب کو راستے سے ہٹایا تھا تو عباد کوراستے سے ہٹانا کیا مشکل تھا اس نے محراب سے وعدہ کیا تھا کہ وہ زارون کا بندوبست کرے گا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی تھی اس سے پہلے ہی وہ اپنی چال چل گیا تھا زینب بیگم اس کی حالت سے بے خبر اور بھی جانے کیا کیا کہتی رہیں مگر وہ کچھ سن ہی کہاں رہا تھا اس کا دماغ تو جیسے ماؤف ہو گیا تھا۔

”اچھا بیٹا..... اب تم آرام کرو میں بھی مجب ہوں بجائے روٹی پانی کا پوچھنے کے اور ہی قصہ لے نہیں۔“ اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ عباد نے یہ مشکل خود کو سنبھالا۔

”نہیں امی..... میں کھانا کھا کر آیا ہوں ابھی بس آرام کروں گا۔“

اندھ ٹھکڑ چل رہے تھے مگر اس نے خود پہ ضبط کر رکھا تھا۔ زینب بیگم سے دعائیں دیتی چلی گئیں تو اس نے کمرہ لاک کر لیا تھا۔ دل کی حالت ایسی تھی گویا پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

کتنا کمزور اور بزدل ثابت ہوا تھا وہ کیا ایک لڑکی کو جس کا کردار پہلے روز سے اس پر واضح تھا وہ سخت مشکل میں

جو چلے تو جاں سے گزر گئے
راہ پارہم نے قدم قدم
تجھے یادگار بنا دیا.....

□.....☆□☆.....□

اگلی صبح رات ہوئے فیصلے کے عین مطابق زامون
محراب کو لے کر شہر نکل گیا تھا مریم بیگم نے بیٹی کو یوں
رخسنت کیا جیسے کسی جنازے کا خرابار گھر سے وداع کرتے
ہیں۔ عباد جو رات سے جاگ رہا تھا حویلی سے زامون
کے نکلنے ہی خود بھی بناء کسی کو مطلع کیے گاڑی لے کر اس کے
پیچھے ہی حویلی سے نکل گیا تھا۔ زینب بیگم سے اسے پتا چلا
تھا کہ فی الحال زامون نے شہر میں کرائے پر کوٹھی لے کر
وہیں محراب کی رہائش کا بندوبست کیا تھا۔ اس کا ارادہ مریم
بیگم کو بھی ساتھ لے جانے کا تھا مگر ان کی حالت ایسی نہ تھی
کہ وہ شہر جا کر رہ سکتیں۔

وہ زامون کا ٹھکانہ دیکھنا چاہتا تھا تا کہ اس سے اپنی
فکست کا بدلہ لے سکے اور اپنے اس مقصد کے لیے اس
نے حویلی سے شہر تک زامون اور محراب کی گاڑی کا پیچھا کیا
تھا۔ شہر کے قدرے پوش ایریا میں کشادہ سڑک پر ایک
نہایت دیدہ زیب بنگلے کے سامنے ان کی گاڑیاں رکی
تھیں۔ عباد کی گاڑی قدرے فاصلے پر نگاہوں سے اوجھل
ہی رہی۔ اس نے دیکھا نارنجی لباس میں ملبوس محراب
عبدا لکریم گاڑی سے یوں اتری جیسے کوئی زندہ لاش
ہو۔ پہلو میں تیزی سے دھڑکتا دل گویا کٹ کر رہ گیا
تھا۔ قدرے فاصلے سے بھی وہ دیکھ سکتا تھا کہ زامون کی
آنکھوں میں کتنی چمک تھی۔

اپنی جیت کی چمک!

اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کی چمک!

وہ قانع تھا اور اس نے کسی قانع کی طرح ہی محراب
عبدا لکریم کا ہاتھ تمام کراے بنگلے کی طرف دھکیلا تھا۔

”تمہارا سوگ ختم نہیں ہوا ابھی تک؟“ بنگلے کی طرف

قدم بڑھاتے اس نے ایک نیکی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ وہ

خاموش رہی تھی۔

اکیلا چھوڑ کر خود ایک طرف ہو گیا تھا۔ کیسی بھری محبت تھی
اس کی کہ اس نے اپنی محبت کا یقین کرنے کی بجائے ابھی
لوگوں کا یقین کیا اور زامون نے اسی سے فائدہ اٹھا لیا ایک
ذرا سی چال سے اس نے ہر وہ راستہ بند کر دیا تھا جس سے
وہ محراب تک پہنچ سکتا تھا جس سے محراب تک اس کی
رسائی ممکن ہو سکتی تھی کتنا شاطر نکلا تھا وہ اور کتنا بڑا بیوقوف
ثابت کیا تھا اس نے عباد عبد لطیف کو..... کاش وہ اس کی
طرف سے غافل نہ رہتا تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ وہ یوں
چھپ کر رہا نہ کرتا۔

اس وقت وہاں کمرے کی کوئی بھی قیمتی چیز اس کے
غصے سے محفوظ نہیں رہ سکی تھی اس کا بس نہ چلا تھا وہ پوری
حویلی کو توڑ پھوڑ کر کھدے کیا سوچتی ہوئی محراب اس کے
بارے میں بس یہی سمجھتی تھی اس کی مراد تھی؟

اس کی محبت؟

اس کا اعتبار؟

ایک بار بھی اس نے اسے خبر نہیں ہونے دی کہ وہ اس
پر شک کرنے لگا ہے اس کے دل میں اس کے لیے بال
آ رہا ہے۔ قطعی بے خبر رکھ کر اس نے اسے سچ منہ ہار میں
اکیلا ڈوبنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ کتنا بڑا نقصان
کر دیا تھا اس نے اس کا ایسا نقصان جس کا از لہ وہ جان
دے کر بھی ادا نہیں کر سکتا تھا۔

کبھی تم کی آگ میں جل لٹھے

کبھی داغ دل نے جلادیا

اے جنون عشق بتاؤ

مجھے کیوں تماشا بنا دیا

غم عشق کتنا عجیب ہے

یہ جنوں سے کتنا قریب ہے

کبھی اشک پلکوں پر دکھ گئے

کبھی سارا دیا بہا دیا

اے جنون عشق بتاؤ

مجھے کیوں تماشا بنا دیا

جور کے لوگوں کو گراں تھے ہم

”تمہارے لیے یہی بہتر ہے محراب عبدالمکریم کہ تم اس حقیقت کو قبول کر لو..... ورنہ مجھے تو جانتی ہی ہو تم بڑے ٹیٹھ محمد صالح کا انسان ہوں زندگی اتنی مشکل بتاؤں گا کہ سانس لینے کو بھی ترسوں گی تم۔“ وہ اس کی جلد چپ سے خائف ہو رہا تھا۔ محراب کے لبوں پہ بڑی مجروح سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”جسہیں اب بھی یہ لگتا ہے کہ میں سانس لینے کو ترسوں
 گی؟“ ”نہم آنکھوں کے ساتھ اس کی زخمی مسکراہٹ نے
 زامون کو تپا کر رکھ دیا تھا۔“

”گویا تم چاہتی ہو کہ زندگی کو ابھی تم پر مزید تنگ کیا جائے۔“

”کر کے دیکھ لو..... سوائے جسم کے کچھ حاصل نہ کر پاؤ گے“

”چلو یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کیا حاصل ہوتا ہے کیا نہیں؟“ وہ کہاں ہار ماننے والا تھا اپنی گاڑی میں ان دونوں کو ساتھ ساتھ چلتے دیکھ کر عباد نے اسٹیرنگ پر زور مار کر کہا تھا۔

وہاں سے حویلی واپسی پر اس کا غصہ گویا آسمان کو چھو رہا تھا۔

مردان خانے میں اس وقت سردار عبدالرحیم اور ان کے دونوں بڑے بیٹے موجود تھے حویلی کے کچھواڑے میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد تیز تیز چلتا وہ سیدھا وہیں پہنچا سردار عبدالرحیم اسے اس وقت شدید غصے میں دیکھ کر پوچھے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔

”کیا بات ہے برخواستہ بہت غصے میں لگ رہے“

”جی ہاں! میں واقعی اس وقت بہت غصے میں ہوں“ کیونکہ مجھے حوٹلی میں اپنی اودا آپ کے بیٹوں کی حیثیت کا ہوتا چل گیا ہے، مگر آپ کو کیا آپ کے سامنے نہ میری کوئی وقفات ہے نہ میرے باپ کی۔“ اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ اپنے کمرے میں آرام کی غرض سے لیٹے سردار عبداللطیف خود کو وہاں آنے سے باز رک سکے۔ سردار عبدالرحیم کے

”کس نے کہا وہ بے گناہ تھی..... حویلی کی روایت کے خلاف شہر کے کالج میں پڑھ رہی تھی وہ اور اسی کالج کے لڑکے کو اس حویلی کے ایک ایک کمین نے خود اپنی آنکھوں سے آدمی رات میں اس کے کمرے سے باہر نکلتے دیکھا تھا اس سے بڑھ کر بے حیائی کی کوئی بات ہو سکتی ہے اور رہی بات تمہیں مطلع کرنے کی تو تم ہم سے اور نہیں ہو بر خود دار..... ہمارے فیصلوں کو چیلنج نہیں کر سکتے تم۔“

”جی ہاں..... بالکل صحیح فرمایا آپ نے“ میری کیا اوقات ہے کہ میں آپ کے فیصلوں کو چیلنج کروں یہ حق تو آپ نے صرف اپنے بیٹوں کو دیا ہوا ہے تب ہی آپ کے سپوت زارون عبدالرحیم نے وہ کر دکھایا جو میں یہاں اپنی غیر موجودگی میں نہیں کر سکا سمندر پار ہو کر بھی اس نے آپ کے فیصلے کو چیلنج کر دیا“ آپ کی بھاگی ہوئی بیٹی کی موت کی سزا شادی میں بدل دی اور کمال یہ کیا کہ آپ میں سے کسی نے بھی اس پر سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کی کہ اس جیسے خود پسند انسان نے اتنی رحم دلی کیوں دکھائی کہ ایک بہن کو خود بے گناہ مراد کر دوسری کو موت کے منہ سے بچالیا..... نہ صرف موت کے منہ سے بچالیا بلکہ اسے اپنا نام بھی دے دیا۔“

”تمہیں کس بات کا ملال ہے نایاب کی موت کا یا اس کی بہن کے زندہ بچ جانے کا؟“ سردار عبدالرحیم کا غصہ کم نہیں ہوا عبادا نہیں دیکھ کر رہ گیا تھا۔

”مہنتی اور اپنے باپ کی حیثیت دو کوڑی ہونے کا ملال ہے مجھے میں حویلی سے باہر تھا میری غیر موجودگی کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے آپ نے میری بہن کو موت کی سزا سنائی اس پر عمل بھی کر لیا..... مگر آپ کا بیٹا جب حویلی سے باہر تھا تو آپ نے ایسا نہیں کیا میرے بابا کی مخالفت کے باوجود آپ نے اپنے بیٹے کی بات کو اہمیت دی اس سے مشورہ کیا جبکہ یہ حال جس میں محراب عبدالکریم کو پھنسا گیا کسی اور نے نہیں خود آپ کے اپنے بیٹے نے ہی بچھایا تھا۔“ آج وہ کہاں کسی سے ڈرنے والا تھا۔ مردان خانے میں گویا آگ بھڑک اٹھی تھی۔

”زبان سنبھال کر بات کرو عباد..... شاید تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم میرے بیٹے پر کتنا بڑا الزام لگا رہے ہو۔“ سردار عبدالرحیم شدید مشتعل ہو کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے دونوں بیٹوں کے چروں پر بھی برہمی صاف دیکھی جاسکتی تھی مگر عباد کو پروا نہیں تھی اس کے اندر جیسے الاؤ دھک رہا تھا۔

”الزام نہیں ہے یہ..... حقیقت ہے میں پچھلی پوری رات ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سویا جب سے پتا چلا کہ آپ کے اعلیٰ ظرف بیٹے نے ایک بھاگی ہوئی لڑکی سے شادی کر لی تب سے ہی اپنے قریبی دوستوں کو اس معاملے کی تحقیق پر لگا دیا تھا اور یہاں تک کہ نیت کا نتیجہ ہے جس سے مجھے نایاب اور محراب کی بے گناہی کے ساتھ آپ کے بیٹے کے گناہ گار ہونے کے ثبوت ملا۔ یہ دیکھیں غور سے دیکھیں اس لڑکے کو یہ وہی لڑکا ہے جسے اس حویلی کے ہر کمین نے اپنی آنکھوں سے نایاب عبدالکریم کے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا..... جانتا چاہیں گے آپ کتنا آدمی رات کو گھراؤ اور شکاری کتوں کی موجودگی میں اس لڑکے کو حویلی میں بحفاظت داخل کرنے والا کون تھا آپ کا بیٹا..... زارون عبدالکریم کیونکہ یہ لڑکا آپ کے بیٹے کا نہایت قریبی دوست ہے اور اسی کے کہنے پر یہاں آدمی رات کو یہاں آیا وہ بھی اس صورت میں کہ نایاب بے خبری کی گہری نیند سو رہی تھی۔ اس معصوم کو تو خبر بھی نہیں تھی کہ اسے بے موت مروانے کے لیے کیسا جال بچھایا جا رہا ہے۔“ اپنا موبائل نکال کر اسکرین پر ایک تصویر زوم کر کے اس نے وہ اسکرین فردا فر داسب کے سامنے کی تھی۔ مردان خانے میں ایک مرتبہ پھر موت کی سی گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

”یہی وہ شخص ہے جسے زارون نے محراب کے انگوٹھے استعمال کیا..... میں خود مل چکا ہوں اس سے محراب کے منہ سے زارون کی سفارش پر ملازمت حاصل کی اس نے مقصد صرف محراب کے لیے جال تیار کرنا تھا اور وہ خط جو محراب کے حوالے سے مجھ تک پہنچا وہ خط محراب نے نہیں

”ہوں..... اس جہنم سے باہر نکل کر مجھے اب جانا بھی کہاں ہے میری دنیا تو کب کی ختم کر چکے ہو تم۔“ یاسیت سے کہتی وہ اسے مسکرانے پر مجبور کر گئی تھی۔

”گڈ..... سمجھدار ہو گئی ہو۔“ فریج سے پانی کی بوتل نکال کر اس نے منہ سے لگالی تھی۔ محراب نے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔

”چلو میں اب تھوڑا گروسری کا سامان لے آؤں تب تک تم چاہو تو آرام کر سکتی ہو۔“ خالی بوتل ایک طرف پھینکتے ہوئے اس نے اسے مطلع کیا پھر اس کے اثبات میں سر ہلانے پر تیز قدم اٹھاتے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

ابھی وہ گاڑی اشارت ہی کر رہا تھا جب اس کے موبائل پر اس کے بھٹے بھائی کی کال آ گئی تھی۔ گاڑی دھیمی رفتار پر ڈالتے ہوئے اس نے کال ریسیو کی تھی۔

”اسلام علیکم؟“

”وعلیکم السلام کہاں ہو تم؟“

”کیوں..... خیریت؟“ مقابل کے لہجے نے اس کو چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”نہیں..... خیریت ہی تو نہیں ہے۔“

”کیوں..... کیا ہوا ہے؟“ آپ ہی آپ اس کا پاؤں بریک پر جا پڑا تھا۔

گاڑی عین ہڑک کے بسط میں رک گئی تھی۔

”یہ پوچھو کیا نہیں ہوا..... عباد نے تمہارے سارے

پول کھول کر رکھ دیے ہیں اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر جو

بھی تم نے نایاب اور محراب کے ساتھ کیا سب کچھ ثبوت

کے ساتھ وہ سب کے سامنے لے آیا ہے بابا اور چچا فی

الحال بہت غصے میں ہیں خود عباد بھی پسل لے کر نکلا ہے

جتنی جلدی ہو سکتا ہے اپنے دوستوں کو آگے پیچھے کر دینے

ہو کر وہ پولیس کے ہتھے چڑھ جائیں اور تمہارے لیے کڑی

مشکل کھڑی کروں..... خود بھی محتاط رہو فی الحال حویلی

آنے یا حویلی کے کسی بھی فرد سے رابطہ کرنے کی حماقت

بلکہ زارون کی دوست غزالہ نے محراب کی ہینڈ رائٹنگ کاپی کر کے خود لکھا تا کہ میں جذبات میں آ کر اسے چھوڑ دوں اور میں نے یہی کیا..... ڈفر جو تھا میں ابھی کل مات پتا چلا یہ لڑکی غزالہ وہی لڑکی تھی جس کے ساتھ زارون کو رنگ رلیاں میناتے نایاب نے دیکھ لیا تھا اور اس نے زارون کو دھمکی دی تھی کہ وہ حویلی کے بڑوں کو اس کی غلط حرکتوں کے بارے میں بتائے گی مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی آپ کے بیٹے نے کمال مہارت سے اپنے شاطر دماغ کا استعمال کرتے ہوئے اس سے پہلے ہی اس کی موت کا پلان بنالیا اور اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔“ ایک ایک ثبوت اس کے موبائل میں موجود تھا۔ مردان خانے میں اس وقت تمام نفوس کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

”کیا منہ دکھائیں گے آپ لوگ روز محشر سردار عبدالکریم کو..... جن کی دونوں بیٹیوں کی زندگی آپ جیسے سرداروں کے ہاتھوں میں ایک کھیل بن کر رہ گئی۔“ وہ مشتعل بھی تھا اور دل برداشتہ بھی۔ سردار عبدالرحیم کا سر جھک گیا ان کے دونوں بیٹوں کے چہروں پر بھی شرمندگی صاف دکھی جا سکتی تھی مگر عباد وہ دیکھنے کے لیے وہاں نہیں رکا..... وہ سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور وہاں سے پسل لوڈ کر کے پھر سے گاڑی میں آ بیٹھا تھا۔ اب جب تک وہ زارون عبدالرحیم سے اپنی شکست کا بدلہ نہ لے لیتا سکون کا ایک لمحہ بھی اس پر حرام تھا۔

حویلی کی خواتین میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ مریم بیگم کے لیوں کو جیسے قفل لگ گیا تھا ان کی پتھرائی آنکھوں سے آنسو بے دریغ بہے جا رہے تھے۔ ادھر حویلی کے حالات سے قطعی بے خبر زارون عبدالرحیم نئے بنگلے میں محراب کے سر پر سوار اسے تنبیہ کر رہا تھا۔

”اس بنگلے کو محض ایک چار دیواری بنا سمجھنا ڈیرہ محراب..... یہ قید خانہ ہے تمہارے لیے جس سے تم میری مرضی کے بغیر ایک قدم بھی باہر نہیں نکال سکتیں سمجھ گئی ناں؟“

نہیں ہوں، حویلی کے مکین تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔“ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ محراب کے لیوں پر تسخیر نہ سی مسکان بکھر گئی۔

”کون سی حویلی..... اس حویلی کی بات کر رہے ہیں آپ جس کی سرخ اینٹوں میں میری بہن سمیت جانے کتنی معصوم بیٹیوں کا خون بہا ہے..... میں اسے حویلی کو اپنی زندگی میں پیچھے چھوڑ آئی ہوں عباد عبداللطیف..... میرا اب اس حویلی یا دہاں کے کسی مکین کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے آپ جائیں یہاں سے۔“

”باکل مت، بنو محراب تمہاری ماں زندہ ہے۔“

”کوئی فرق نہیں پڑتا، انہیں جس حال میں چھوڑ کر آئی ہوں ویسا حال زندہ لوگوں کا نہیں ہوتا۔“

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا..... تم اس شخص کے ساتھ رہنا چاہتی ہو جو تمہاری عزت اور تمہاری بہن کا قاتل ہے۔“ عباد کا پاراہائی ہوا تھا۔ محراب نے آہستہ سے اپنی کلائی اس کی گرفت سے چھڑائی تھی۔

”میں اس شخص کے ساتھ جانے سے انکار کر رہی ہوں جو میری محبت اور دل کا قاتل ہے۔“

”مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے محراب..... اسی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔“

”آپ کی غلطی نے میری زندگی برباد کر دی، میرے زندہ جاوید دھڑکتے دل کو مقبرے میں بدل دیا، دل مقبرے بن جائیں تو پھر ان کا کوئی ازالہ نہیں ہوتا۔“

”تم جذباتی ہو رہی ہو محراب..... میں نے ساری حویلی میں تمہاری اور نایاب کی پارسائی ثابت کر دی ہے..... میری بابا اور بڑے تایا دونوں شرمندہ ہیں، زارون عبدالرحیم کی اب اس حویلی میں کوئی جگہ نہیں رہی، تم چلو میرے ساتھ، میں خود تمہاری اس سے طلاق دلوں کر پھر سے اپنے نکاح میں لوں گا، میرا یقین کرو پلیز۔“

”یقین ہی تو کیا تھا تب ہی تو منہ کے بل گرا دیا گیا مجھے..... اچھی طرح میرے کردار سے واقف ہونے کے باوجود صرف چند لمحوں میں آپ نے اپنی زندگی سے مکھن

میں بال کی طرح نکال پھینکا..... بدھم موت مرنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا، آپ کو کیا لگتا ہے میں پھر وہی غلطی دہراؤں گی، نہیں عباد میرے اندراب اور مسامحہ ہونے کی ہمت نہیں ہے، خدا کا واسطہ ہے آپ کو مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔“ یہ محراب وہ محراب نہیں تھی جسے اس نے اپنی زندگی میں بھرپور چاہت کے ساتھ شامل کیا اور پھر ایک چھوٹی سی بدگمانی پر چپ چاپ بنا، کسی بات کی تحقیق کیے اسے اپنی زندگی سے نکال بھی دیا تھا۔ یہ تو کوئی اور محراب تھی۔ روٹی ہوئی زندگی سے خفا اور بے حد مضبوط محراب۔ وہ بے بسی سے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

”کیا اب تمہارے اندر میرے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش سر نہیں اٹھاتی؟“

”نہیں.....“

”ایسا مت کہو محراب..... میں مانتا ہوں میں نے تمہارے ساتھ ظلم کیا مگر..... اس کی اتنی بڑی سزا مت دو کہ میں زندگی کو رستار ہوں۔“ اونچا لہا بے حد خوب صورت وہ مرد اس کے سامنے بے بس ہوا تھا۔ محراب نے لب بھینچ کر اپنے آنسو اپنے اندر اتار لیے تھے۔

”میری اتنی اوقات نہیں ہے کہ میں کسی کو کوئی سزا دے سکوں، بس میری اتنی سی التجا ہے حویلی والوں کے ساتھ ساتھ آپ بھی مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں، اپنے لیے میں مر چکی ہوں آپ لوگ بھی مرنا سمجھ کر بھول جائیں۔“

”میرے بس میں نہیں ہے یہ۔“ نوراً سے چہرہ تر اس نے کہا تھا۔ محراب نے رخ پھیر لیا تھا۔

”میری مشکلات مت بڑھائیں عباد..... خدا کا واسطہ ہے آپ کو۔“

”میں تمہیں کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتا محراب..... کسی قیمت پر بھی نہیں۔“

”آپ مجھے کھو چکے ہیں عباد..... اب گڑھے مردے اکھاڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”ٹھیک ہے جیسا تم کہو مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تم سے دستبردار ہو رہا ہوں، جس طرح زارون نے گھنیا چال

چل کر تمہیں مجھ سے الگ کیا ہے میں بھی اسی طرح تمہیں اس سے الگ کر کے پھر سے اپنی زندگی کا حصہ بناؤں گا یاد رکھنا تم۔“

”بس کر دیں آپ..... خدا کا واسطہ ہے آپ کو مجھے فٹ ہال کیوں سمجھ لیا ہے آپ نے کیا میرے کوئی جذبات اور احساسات نہیں میں انسان نہیں ہوں۔“ وہ چلائی تھی۔ عباد سے دیکھ کر رہ گیا۔

”جائیں آپ یہاں سے اور دوبارہ زندگی میں کبھی پلٹ کر مجھے اپنی شکل مت دکھائیے گا۔“ کسی بارود کی طرح وہ پھٹ پڑی تھی۔ عباد نے لب بھینچ لیے تھے۔

”ٹھیک ہے مگر..... یہ جنگ ابھی نہیں ختم نہیں ہوئی ہے محراب..... جب تک زارون عبدالرحیم زندہ ہے سمجھ لینا سکون کی نیند حرام ہے مجھ پر۔“

”آپ کا مسئلہ ہے یہ..... میرا اس سب سے کوئی لینا دینا نہیں۔“

جتنا بے رحم وہ اپنے لب و لہجہ کو کر سکتی تھی اس نے کر لیا تھا۔ عباد ایک پر شکوہ نگاہ اس پر ڈالنے کے بعد وہاں سے نکل گیا تھا۔ محراب نے اس کے گیٹ سے نکلنے ہی لاک لگایا اور پھر وہیں زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ آنسوؤں کا سیلاب تھا کہ الٹا پڑ رہا تھا۔

□.....☆□☆.....□

شب کے بارہ بج رہے تھے مگر ابھی تک زارون کی گھر واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اجنبی علاقے کے اجنبی گھر میں دن تو اس نے جیسے تیسے گزار لیا تھا مگر شام اور شام کے بعد رات گزارنے کا خوف اس کی ہڈیوں کا خون خشک کر رہا تھا۔ زارون سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ پوری رات گھر نہ آتا۔ اسے ستانے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ جنگلے کی لائیں آن تھیں مگر اس کے باوجود اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ بالکل اکیلی کسی اجنبی جگہ پر چب چاب رہ رہی تھی۔ صبح سے پانی کی ایک بوتل بھی اس کے اندر نہیں گئی تھی۔ پچھلے تین روز سے ویسے ہی اس نے برائے نام کھانا کھایا تھا اب تو بھوک کی وجہ سے باقاعدہ

چکڑا نے لگے تھے۔ کیسی عجیب بے بسی تھی کہ بے گناہ ہونے کے باوجود وہ اذیت ناک سزا کاٹنے پر مجبور تھی۔ خوف اور بھوک کے غلبے نے اس کی نیند بھی اڑا دی تھی۔ گزرتا ایک ایک لمحہ اس کے لیے صدیوں پہ بھاری تھا تب ہی ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے وہ واپس لوٹا تھا۔

ڈھیر سارے شاپنگ بیگز کے ساتھ تھکا تھکا سا وہ قدرے پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ محراب سرسری نگاہ اس پر ڈالنے کے بعد ٹھس سی وہیں بیٹھی رہی تھی۔ تب ہی وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟“

”نہیں.....“ وہ رکھائی سے بولی۔ زارون کے چہرے پر الٹا آنے والی ناگواری صاف دیکھی جاسکتی تھی۔

”ذکیوں سارا دن پیچھے کیا حل چلائی رہی ہو؟“

”یہی سمجھ لو۔“

”تو ٹھیک ہے پھر مجھ سے بھی کسی فیور کی توقع مت رکھنا۔“

”یا گل نہیں ہوں میں جو تم سے کسی فیور کی توقع رکھوں گی۔“ وہ جلی بیٹھی تھی۔ زارون گھور کر رہ گیا۔

”چلو اچھی بات ہے..... میرا کیا ہے میں تو باہر سے کچھ نا کچھ کھاپی کے آ جاؤں گا تم مرنا دن رات اس جنگلے میں بھوکی۔“

”مرنا ہی تو چاہتی ہوں..... تمہارے جیسے جانور کے ساتھ ذلت آمیز زندگی گزارنے سے ہزار درجے بہتر ہے کہ میں بھوکی مر جاؤں۔“ وہ کہاں ادھار رکھنے والی تھی۔ زارون کے تلوؤں پر لگی سر پر بھی۔

”اسی زبان درازی کا نتیجہ ہے جمنا ج بھگت رہی ہو مگر..... مجال ہے جو باز آ جاؤ پتا بھی ہے کتنا ٹیڑھا بندہ ہوں میں۔“

”تم اب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے زارون عبدالرحیم..... جتنا برا کر سکتے تھے کر چکے ہو اب میں نہیں ڈرتی تم سے۔“

”اچھا.....؟“ اس کی بے خوف سیاہ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ قریب چلا آیا تھا۔

اگلی صبح وہ تیز بخار میں پھنک رہی تھی۔ زارون رات شاور لینے کے بعد پیٹ پوچھا کر کے سکون کی نیند سوچ کا تھا۔ اب وہ جس حال میں تھی اسے اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں کے تقریباً سوا گیارہ بجے کھلی تھی وہ بھی اپنے ہی موبائل کی تیز رنگ سے قدرے غنودگی میں بھی اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل ہاتھ میں لیا تھا۔ بڑے بھائی کی کال تھی اس کی نیند بھک سے اڑ گئی۔

”السلام علیکم بھائی۔“

”وعلیکم السلام کہاں ہو؟“

”کیوں خیریت؟“

”خیریت خیریت نہیں ہے بابا سائیں کو رات شدید ہارٹ ایکٹ آیا ہے ہم لوگ فوراً شہر کے ہسپتال لے گئے تھے مگر ان کی حالت بہتر نہیں ہوئی ڈاکٹرز کے مطابق اگلے بارہ گھنٹے بہت اہم ہیں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ ان کا لہجہ ان کی پریشانی کی چٹلی کھا رہا تھا۔ زارون بے چین ہوا اٹھا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں بھائی۔۔۔۔۔ بابا کو کچھ نہیں ہو سکتا۔“ اس کا لہجہ کچھ پھیلا تھا جب وہ بولے۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔۔۔۔۔ تم مل لو آ کر معافی مانگ لو نہیں تو ساری عمر کا کچھ تدارک جائے گا۔“

”اللہ نہ کرے بھائی۔۔۔۔۔ آپ مجھے ہسپتال کا بتائیں میں فوراً پہنچ رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے آ جاؤ۔“ کہتے ہی انہوں نے فوراً کال کاٹ کر اسے ہسپتال کا نام اور لوکیشن سینڈ کر دی تھی۔ زارون نے میسج ملتے ہی فوراً بستر چھوڑا اور منہ پر ٹشڈے پانی کے چھپاکے مار کر اپنا والٹ اور موبائل اٹھاتے ہوئے فوراً گھر سے نکل گیا تھا۔ محراب کس حال میں تھی اسے یہ دیکھنے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔

گاری فل اسپڈ میں چھوڑ کر اگلے ہندہ منٹ میں وہ ہسپتال پہنچ گیا تھا۔ سردار عبدالرحیم انتہائی نگہداشت کے

”تو میں اب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے ناں؟“ کچھ تھا اس کی آنکھوں میں جس نے ایک پل کے لیے محراب کو سہا دیا تھا اگلے پل اس کی چمکتی آنکھوں سے خوف کھائی وہ رخ پھیر چکی تھی۔ مگر زارون نے دائیں ہاتھ سے اس کا جبر او بوج کر اس کا رخ پھر اپنی طرف موڑ لیا تھا۔

”تمہاری وجہ سے صرف تمہاری وجہ سے مجھے تمہاری بہن اور اپنی سگی چچا زاد کو موت کے منہ میں دھکیلنا پڑا اپنے باپ بھائی اور چچا کی نظروں سے گرنے پڑا کیسی پلاننگ نہیں کی صرف تمہیں پانے کے لیے اور تم ہو کر ابھی بھی آنکھیں دکھا رہی ہو۔۔۔۔۔ اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود بھی عقل ٹھکانے نہیں آئی تمہاری؟“

دائیں ہاتھ سے اس کا جبر او بوج اس نے اپنا منہ عین اس کے منہ کے قریب کیا تھا۔ محراب کی سانس الجھنے لگی تھی۔

”میں نے کہا تھا ناں چاہے کچھ بھی ہو جائے تم گولی کا نشانہ نہیں بنو گی اور دیکھو میں نے اپنا وعدہ وفا کیا اب میں کہہ رہا ہوں تم میرے سوا دنیا میں کسی دوسرے مرد کی نہیں ہو سکو گی یہ وعدہ وفا کرنے کا وقت بھی آچکا ہے۔“ اپنا منہ اس کے کان میں گھسائے تقریباً سرگوشی میں اس نے اسے مطلع کیا تھا وہ تڑپ کر رہ گئی۔

”چھوڑو مجھے۔“ مگر وہ کہاں اس کی خواہش کا احترام کرنے والا تھا اسے تو اپنی بات پوری کرنی تھی اندر کی فریشتن نکالنی تھی تب ہی اس کے آہنی وجود کے سامنے وہ ریت کی دیواریں سہا رہتی گئی۔

تقریباً رات دو بجے کے قریب اس نے اپنے بستر پر اسے سسکا چھوڑ دیا تھا۔

محراب کو لگا جیسے نایاب کی طرح اس کی بھی موت ہو گئی ہو وہ شخص اس کے تصور سے بھی زیادہ بے حس اور سفاک تھا۔

اس وقت بھی جب وہ اس کے دیئے گئے زخموں پر سسک رہی تھی وہ بنا اس کی تکلیف کی پروا کیے بے نیاز گھر سے نکل گیا تھا۔

کیے جانے کے قابل نہیں تھے۔ وہ گہری لگا ہوں سے اسے گھورتا بنا حویلی میں خرید کسی سے ملے وہاں سے نکل آیا تھا۔

.....☆☆☆☆.....

رات دیر تک سڑکیں تاپنے کے بعد شب کے بارہ بجے اس کی گھر واپسی ہوئی تھی۔ سارا بنگلہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا دل ڈوب کر ابھرا تھا۔ کل ظہر کے قریب وہ بنگلے سے نکلا تھا اور اب اگلے دن کے بھی رات کے بارہ بج رہے تھے جانے محراب عبدالکریم کس حال میں تھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتے لان عبور کرنے کے بعد وہ ہال کمرے میں آیا تھا۔

”محراب.....“ کمرے کی لائٹس آن تھیں مگر وہاں محراب کا وجود نہیں تھا تب ہی اس نے دھاڑ کر آواز دی تھی مگر جواب نہ دار وہاں اس بنگلے میں کوئی آ نہیں سکتا تھا خود وہ کہیں جا نہیں سکتی تھی تو پھر کیا ہوا تھا یوں اچانک کہاں جا سکتی تھی وہ پہلے سے منتشر دماغ مزید منتشر ہوا تھا۔ پاگلوں کی طرح اسے گھر کے ایک ایک کونے میں ڈھونڈتا وہ جیسے اپنے ہواس کھو رہا تھا۔ تب ہی اس کی نظر اس پر پڑی تھی۔ بیڈ کی دوسری طرف وہ نیچے زمین پر بے ہوش پڑی تھی یوں کہ اس کا وجود آدھے سے زیادہ چھپ گیا تھا۔ شکستہ قدم اٹھاتا وہ اس کے قریب آیا پھر اس کی نفیس چپک کی جو کہ بے حد آہستہ چل رہی تھی ایک پل کے لیے اسے اس کی حالت پر رحم آیا اگلے ہی پل وہ پھر بے حس ہو گیا۔ محراب کو بیڈ پر سنانے کے بعد وہ فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال لایا تھا۔ محراب کے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھپکے مار کر اس کو ہوش دلانے کے بعد وہ اس کے لیے چائے اور بریڈ لے آیا تھا۔

”اٹھو..... یہ کھالوشا باش۔“ محراب کی کھلی آنکھوں کی سرخی سے لگا ہوا جہاتے ہوئے اس نے خلاف توقع نرم لہجہ اختیار کیا تھا جواب میں محراب کی آنکھیں پھر بند ہوئی تھیں ایک تو مسلسل بھوک کی قنات اور پر سے تیز بخار نے اسے نچوڑ کے رکھ دیا تھا۔ زارون کو خبر ہی نہیں تھی کہ

دار میں تھے وہ ڈاکٹر سے مل کر ہتھ کی پروا کیے دم میں گھس گیا تھا۔ سردار صاحب کو آکسیجن لگی تھی اس نے قریب جاتے ہی ان کے دلوں پاؤں پکڑ لیے پھر سا بے حس مضبوط دل پانی بن گیا تھا۔ سردار صاحب کے دلوں پیروں کو ہار بار عقیدت سے چومتے ہوئے وہ دل ہی دل میں ان سے معافی مانگتا بلکہ آواز دہراتا تھا۔

اگلے چالیس منٹ کے بعد اس کا روٹا معافی مانگنا سب بیکار گیا کیونکہ سردار صاحب نے ایک بار بھی آنکھ کھول کر اسے دیکھے بغیر دنیا چھوڑ دی تھی ایک قیامت تھی جس کا سامنا اس وقت زارون عبدالرحیم کو کرنا پڑا تھا دل جیسے کسی نے نوح کر پہلو سے نکال لیا تھا۔ زندگی بھر اس کے لاڈ اٹھانے والے اسے سب براہیت دینے والے اس کی ہر خواہش اور فرمائش منہ سے نکلنے سے پہلے ہی پوری کرنے والے سردار عبدالرحیم اپنے لاڈ لے کو بناء معاف کیے ضمیر کا بوجھ دل پر لے کر ابھی نیند سو گئے تھے۔ وہ آنکھوں سے خون بہاتا رہا بلکہ رہا مگر کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ایک کھرام تھا جو حویلی میں اٹھا تھا۔ سرخ اینٹوں سے تعمیر قلعہ نما حویلی میں ٹاپا عبدالکریم کے ساتھ ان کی لہد تیار کر دی گئی تھی۔ تدفین کے بعد اپنے بھائیوں سے مل کر وہ حویلی سے نکل رہا تھا جب اس کا سامنا عباد عبداللطیف سے ہوا تھا اسے دیکھتے ہی زارون کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔ عباد عبداللطیف کی آنکھوں میں ہلکولے لیتی نفرت بھی اس سے چھپی نہ رہ سکی تھی مگر وہ بنا پروا کیے اس کے مقابل کھڑا ہو کر تلخ لہجے میں بولا۔

”میرے بابا کی سموت تمہارا مجھ پر فرض ہے ڈیر کرن..... اور میں نے بھی کسی کا قرض زیادہ دن تک خود پر رکھا نہیں یاد رکھنا یہ بات۔“ صرف آنکھوں سے ہی نہیں اس کے لہجے سے بھی ابھونک رہا تھا۔ عباد عبداللطیف کے لبوں پر خفیس مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

”یہ تو وقت ہی بتائے گا زارون عبدالرحیم کہ کون کس کا قرض اتارتا ہے۔“ اس کے الفاظ اور مسکراہٹ نظر انداز

وہ جو چند گھنٹے کہیں اکیلی نہیں رہی تھی پچھلے اٹھارہ گھنٹوں سے اکیلی تھی اسی خوف نے اس کے اعصاب سلب کر دیئے تھے۔ زارون نے اس بار اس کی پلکیں بند ہونے پر پوری پانی کی بوتل اس کے سر پر اٹھیل دی تھی۔

”آ نکلیں گھولو محراب..... تمہارے باپ کا لو کر نہیں
ہوں میں جو یہاں بیٹھ کر تمہیں ہوش میں لانے کی
کوششیں کرتا ہوں۔“ اس بار اس کی آواز بلند ہوئی
تھی مگر محراب کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ تب
ہی وہ خالی بوتل غصہ سے اس پر پھینکتے ہوئے وہاں سے
اٹھا تھا۔

”مروتھم۔“ کہے کوئی احساس نہیں تھا کہ وہ اس کی وجہ سے بے قصور کس حال میں تھی۔ وہ رات اس نے مسلسل سگریٹ نوشی کرتے ہوئے ساری دنیا سے بے نیاز صرف اپنے باپ کو یاد کرتے ہوئے گزاری تھی۔ محراب زندہ رہتی ہے یا نہیں، یہ اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ فی الحال اس کے لیے دنیا کا سب سے بڑا غم اپنے محبوب باپ سے دائمی جدائی تھا اور یہ ایسا غم تھا جس کا کوئی عداوہ نہیں ہو سکتا تھا۔

□.....☆□☆.....□

رات کا پچھلا پہر شروع ہو چکا تھا جب اس کی آنکھ کھلی
تھی۔

بخار کی شدت کم ہو چکی تھی مگر نقاہت باقی تھی بہ مشکل امت کر کے اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو سر چکرا کر رہ گیا تھا۔ گھومتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے وہ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی تب ہی اسے بیڈ کے سامنے ہی صوفے پر بیٹھا زارون عبدالرحیم دکھائی دیا تھا اس کا دل چاہا وہ اٹھ کر اس کا گریبان پکڑے اور اس کے چہرے پر بنا مجازی خدا ہونے کا احساس کیے پے درپے پتھروں کی برسات کر دے جمائے وہاں اس کو پوچھنا کہ بنگلے میں قید کرنے کے بعد اس کے وجود سے یکسر غافل ہو چکا تھا۔ مگر ابھی وہ اس قابل نہیں تھی تب ہی خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی

تھی۔ زارون نے ایسے اٹھ کر وائش روم کی طرف جاتے دیکھا تھا وہ ٹنڈ حال تھی۔ وہ بے حس سا اپنی جگہ بیٹھا رہا تھا۔ محراب وائش روم سے باہر آئی تو اسے بھوک کا احساس ہوا تھا۔ کچھ پکا کر کھانے کی اہمیت ہی نہیں تھی اور زارون سے ایسی نیکی کی امید رکھنا بیکار تھا تب ہی وہ اسے نظر انداز کرتی چکراتے سر کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

کچن میں چائے کا سامان موجود تھا اسے ہی غنیمت جانتے ہوئے اس نے فوری چائے بنا کر وہاں سلیب پر رکھے سامان میں ڈھونڈ کر بسکٹ نکال لیے۔ بھوک سے وہائیاں دیتے معدے کے لیے فی الحال یہی بہت تھا۔ ایک پمکٹ بسکٹ کے ساتھ چائے پی کر وہ کمرے میں واپس آئی تو زارون جیسے ہی اس کا انتظار کر رہا تھا۔

لایٹر سے سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے ایک سرسری نگاہ محراب کے شکستہ جود پر ڈالی تھی۔
 ”کل صبح حویلی جانا ہے تیار رہنا۔“

”کیوں؟“ بے ساختہ حیران ہوتے ہوئے اس نے اسے دیکھا تھا بات ہی ایسی تھی بھلا جس حویلی سے وہ ہمیشہ کے لیے تعلق توڑ آئی تھی اس حویلی میں واپسی ایک سوالیہ نشان ہی تو تھا۔ مازوں نے گہرا حش لے کر دھواں فضا میں چھوڑ دیا تھا۔

”ضروری ہے اس لیے۔“

”میری ضرورت نہیں ہو سکتی حویلی والوں کو۔“

”میں نے کب کہا کہ حویلی والوں کو تمہاری ضرورت ہے..... میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ فی الحال وہاں جانا ضروری ہے۔“

”وہی تو پوچھ رہی ہوں، میرا وہاں جانا کیوں ضروری ہے جبکہ مجھے خود حویلی والوں نے سولی چڑھا کر وہاں سے دیر بدر کر دیا ہے۔“ اس کے لہجے میں ٹوٹے کاغذ سی جھمن تھیں۔ زارون کو اس کے الفاظ بے حد ناگوار گزرنے لگا، تاہم وہ ضبط کر گیا۔

”جستہیں سولی چڑھانے والا دنیا میں نہیں رہا اس لیے۔“ اس بار اس کا لہجہ دھماتھا۔ محراب مل کر رہ گئی۔

”کیا کہتم نے؟“ اسے جیسا بی سہمتوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ زارون نے اذیت سے پلکیں موند لیں۔

”اپنی بات بار بار دہرانے کا قائل نہیں ہوں میں..... کل صبح تمہیں میرے ساتھ حویلی چلنا ہے اور بس۔“ اسے اگر عباد عبداللطیف کی طرف سے ملنے والی دھمکی کا خوف نہ ہوتا تو شاید وہ بھی اسے اپنے ساتھ حویلی نہ لے جاتا..... محراب اسے یہاں اکیلے چھوڑنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ جو شخص اپنی تیز ترین خفیہ رات سے اس کے جرائم کا پتا لگا سکتا تھا اس کے لیے اس لڑکی کا پتا لگانا طبعی مشکل نہ تھا۔ اور وہ جو اس لڑکی کے لیے اپنا سب کچھ گنوا کر بیٹھا تھا اب کسی طور اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ مگر یہ بات محراب عبدالکریم نہیں جانتی تھی تب ہی وہ تلخ لہجے میں بولی تھی۔

”پورے اٹھارہ گھنٹے مجھے اس جہنم میں مرنے کے لیے اکیلا چھوڑ کر اب تمہیں اس بات کا احساس ہوا ہے کہ مجھے تمہارے ساتھ اس خونی حویلی میں جانا چاہیے؟“

”ہاں۔“

”میں نہیں جاؤں گی۔“

”میں نے تمہاری اجازت نہیں لی..... تمہیں صرف انکار کیا ہے۔“

”تم مریکوں نہیں جاتے زارون عبدالرحیم۔“ وہ زنج ہوئی تھی۔ زارون کے لیوں پر تلخ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”تمہاری بددعاؤں نے میرے باپ کی جان لے لی کیا یہ کافی نہیں ہے؟“

”شٹ اپ۔“ وہ ہرٹ ہوئی تھی۔ زارون سگریٹ کے بکولے بنا کر کمرے کی فضا کو بو بھل کرتا رہا تھا۔

☆☆☆.....

اگلی صبح نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے ساتھ حویلی جانے کے لیے گاڑی میں آ بیٹھی تھی۔ کل رات جو عذاب اس نے بنگلے کی تنہائی میں سہا تھا پھر سے وہی عذاب دوبارہ پہننے کی اہمیت نہیں تھی اس میں تب ہی وہ گاڑی میں آ بیٹھی تھی۔ زارون نے اسے بھی اپنی فتح کے کھاتے میں درج

کرتے ہوئے چپ چاپ گاڑی حویلی کے رستے پر ڈال دی تھی۔ اگلے یون گھنٹے کے بعد وہ زارون کے ساتھ حویلی پہنچی تو مریم بیگم اسے دیکھتے ہی یوں اس سے لپٹ کر روئیں گویا وہ برسوں بعد ملی ہو۔ محراب حیران سی انہیں دیکھے گئی۔ حویلی میں اس وقت سردار عبدالرحیم اور نایاب کے لیے قل خوانی میں ختم قرآن پاک کا انتظام ہو رہا تھا۔ محراب میں سب کے درمیان بیٹھنے کی ہمت نہیں تھی لہذا بنا کسی سے ملے وہ ست روئی سے چلتی اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ مریم بیگم بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ آئی تھیں۔

”کیا حال بنا لیا ہے تم نے اپنا محراب کیا بہت تشدد کرتا ہے زارون تم پر؟“ اسے بیڈ پر لٹاتے ہوئے وہ فکر مند سی بولی تھیں۔ محراب کے لیوں پر محروح سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

”کیا فرق پڑتا ہے امی..... قسمت میں تو یہی لکھا تھا۔“

”میں نے منع کیا تھا درس میں مت جاؤ مگر..... تم نے میری نہیں سنی۔“

”درس میں نہ جاتی تو کیا ہو جاتا امی..... اس نے جو ٹھان لی تھی وہ کرنی تھی درس چھوڑ بھی دیتی تو وہ حویلی میں ہی کوئی نہ کوئی الزام لگا دیتا نایاب کے ساتھ جو ہوا بھول گئی آپ؟“

”نہیں..... کچھ نہیں بھولی میں بس اسی دن سے ڈرتی تھی میرا ڈر میرے سامنے آیا۔“

”ڈرنا چھوڑ دیں امی..... ہمارے پاس اب کھونے کے لیے کچھ نہیں رہا۔“ اس کا حال ایسا تھا جیسے کوئی صحرا میں آبلہ پا جانے کتنی مسافت طے کر کے منزل پر پہنچا ہو۔ مریم بیگم اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

”کاش میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی میری بیٹی۔“ وہ آرزو تھیں۔ محراب اپنی ہتھیلیوں کو دھکتی اداسی سے مسکرا دی۔

”میرے لیے نہیں..... کاش آپ نایاب کے لیے کچھ کر سکتیں۔“

”ہاں بہت بد نصیب ہوں میں..... خدا میرے جیسی بے بس ماں کسی کو نہ دے جو اپنی دونوں بیٹیوں کے لیے کچھ نہیں کر سکی۔“

وہ رو پڑی تھیں۔ محراب نے محبت سے ان کی دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”خود کو لازم دے کر دکھی ہونا چھوڑ دیں امی..... اس حویلی کی کوئی عورت کبھی بھی اپنے حق کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔“

مریم بیگم کا سر جھکا تھا۔ کمرے میں چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔ تب ہی مریم بیگم بولی تھیں۔

”عباد بہت پشیمان ہے..... معافی مانگنا چاہتا ہے تم سے۔“

”کس بات کی معافی؟“

اس نے اچانک سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا تب ہی وہ بولیں۔

”اس سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے محراب..... بہت دکھی ہے وہ۔“

”کوئی پرواہ نہیں..... میرے دل سے اتر گیا ہے وہ۔“

”نہیں محراب..... ایسا تم کہو صرف وہی ہے جو تمہیں اس شیطان کی قید سے آزاد کر سکتا ہے۔“

”مجھے اس شیطان کی قید میں پہنچانے والا بھی وہی ہے..... نا وہ طلاق دیتا تا میں اس شیطان کی قد میں جاتی۔“

”اس سے غلطی ہو گئی بیٹا..... وہ غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔“

”بس کروں امی..... گڑھے مردے اکھاڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ویسے بھی زارون عبدالرحیم میری واپسی کا ہر راستہ بند کر چکا ہے۔“

”تم اس کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتیں میری بیٹی۔“

”میں اب عباد کے ساتھ بھی کبھی خوش نہیں رہ سکتی امی۔“ اس کے پاس ہر سوال کا جواب تھا۔ مریم بیگم بے بسی سے سر جھکا کر رہ گئیں۔

”میں اب تھوڑی دیر سونا چاہتی ہوں۔“ چند لمحوں بعد اس نے کہا تھا۔

”ٹھیک ہے سو جاؤ۔“ مریم بیگم ہٹھ کھڑی ہوئیں۔

”آج رات ٹھرو گی ناں؟“ کمرے سے نکلتے ہوئے انہیں یاد آیا تھا۔

محراب نے بالوں کو کچھر کی قید سے آزاد کر کے سر تکیے پر رکھ دیا۔

”پتا نہیں امی..... اس جلاد کا کوئی پتا نہیں وہ ٹھرتا ہے یا نہیں۔“

”تم کہو تو میں بات کر کے دیکھوں اس سے؟“

”نہیں..... میں نہیں چاہتی میرے یہاں بٹھرنے سے پھر حویلی میں کوئی ہنگامہ ہو عباد بھی نہیں ہے میں اس کا سامنا بھی نہیں چاہتی۔“

”ٹھیک ہے بیٹا..... جیسے تمہاری مرضی۔“ سر اٹھاتے میں بلا کر لائٹ آف کرتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔ محراب نے آنکھیں بند کر لیں۔

پچھلے تین روز کی نیند پوری کرنی تھی مگر زارون نے ایسا نہیں ہونے دیا تھا ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی جب اس نے مریم بیگم کو واپسی کا پیغام بھجوایا تھا۔

”تھوڑی دیر اور رک جاتے بیٹا..... محراب سو رہی ہے شاید طبیعت ٹھیک نہیں اس کی۔“ وہ خود اس کے سامنے کھڑی التجا کر رہی تھیں۔ کلائی پر گھڑی باندھتے ہوئے اس نے سرسری نگاہ انہیں دیکھا۔

”نہیں بچی..... میں پہلے ہی لیٹ ہو چکا ہوں اسے اٹھائیں ابھی لکھنا ہے۔“ اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی مزید اصرار نہ کر سکیں۔ محراب سو رہی تھی جب مجبوراً انہیں اسے اٹھانا پڑا۔

”محراب۔“ ایک دو بار آوازیں دینے کے بعد انہوں نے اس کا کندھا جھنجھوڑا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر جاگ گئی۔

”جی.....“

”زارون بلارہا ہے۔“

”کیوں خیر ہے؟“

”کیا تائم ہوا ہے؟“

اس کی پسندیدہ سوری رہ گئی

”ٹھیک ہے۔“

وہ دوپٹا اٹھا کر سر پر سلیقے سے اوڑھ رہی تھی جب مریم بیگم نے کہا۔ محراب کی نظریں ان کے چہرے پر جم گئیں۔
”جی کہیں۔“

”جانتی ہوں..... بے فکر ہیں آپ۔“

”جی.....“ اس کی نظریں بدستوران کے چہرے پر جچی
تھیں تب ہی وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولیں۔

”میں آپ کی تکلیف بخوبی محسوس کر سکتی ہوں امی.....“

آمل، بحولہ

”جاؤ میری جان..... اللہ تمہارا حافظ و نگہبان ہو۔“

وہ لوگ حویلی سے گھر پہنچے تو مغرب کا وقت تھا۔

”تم سے مطلب؟“

”کوئی مطلب نہیں مگر..... میں اس دیویہ کل بنگلے
ات کے قریب کیسی نہیں رہ سکتی۔“

”تو.....؟“ قطعی انجان بنے ہوئے اس نے ابرو

میں نے تھے۔ محراب خون کے کھونٹ پی کر رہ گئی۔

کویہ لہ المراج کی رات مجھے اس ہنسنے میں پھنسی

میں جسم کا کہتے ہیں اور سال نہیں ” منہ لگا۔“

اور..... یعنی تم کہنا چاہتی ہو کہ مجھے رات ٹل رہی ہے۔

ت میں یہاں تمہارے پاس ہونا چاہیے۔ "اسٹیرنگ

سروہ گاڑی سے باہر نکل آیا تھا۔ ”وئیے یہاں نہیں

و کہاں رہو گی ہوں؟“

جہم میں..... اس کی عیس دلائی آٹھوں میں عے

بچے ہوئے دھڑل کر پڑی۔ جواب میں وہ ہنس

پلوں تکھتے ہیں پھر کس جہنم میں رات ہی ہوتی ہے۔“ مزے

تے ہوئے وہ پھر سے گاڑی میں جا بیٹھا تھا۔ محراب

میں۔

پورے بچلے کی لاش آن کرنے کے باوجود تنہائی کا خوف دل کو پریشان کر رہا تھا۔ وہ بیڈروم سے نکل کر میسر پر چلی آئی تھی۔

تب ہی اس کی سماعتوں میں نیچے گیٹ پر ہونے والی زوردار دستک کی آواز گونجی تھی۔ وہ چونک گئی۔ شاید زارون آ گیا تھا۔

شاید اس کی دھمکی کام گرنی تھی جو اس نے زامون کو دی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ سڑک کے اس پار دکھائی دینے والے منظر سے نگاہ ہٹائی نیچے چلی آئی تھی۔

محفل جیسے اس گھر میں زارون نے اس وقت تک نہ کسی گارڈ کا انتظام کیا تھا نہ کسی اور ملازم کا شاید وہ اسے تنہائی کی اذیت میں رکھنا چاہتا تھا یا شاید اسے ابھی کسی پر اعتبار نہیں تھا۔ انہی خیالوں میں ابھی وہ گیٹ تک آئی تھی۔

”کون؟“ گیٹ کھولنے سے پہلے اس نے پوچھا تھا۔

جب جواب آیا۔

”عباد عبداللطیف دروازہ کھولو۔“ محراب کا دل
 جھڑکا تھا۔ تاہم اس نے لاک نہیں کھولا۔
 ”چلے جائیں یہاں سے..... اس گھر میں آپ سے
 ملنے والا کوئی نہیں رہتا۔“

”پاکل مت بنو محراب..... میں تمہیں ایک قاتل کی
تقد سے رہائی دلانے آیا ہوں۔“

”مجھے نہیں چاہیے رہائی۔“ بلندآواز میں وہ چلائی تھی۔
 ”جسہیں میری بات سنی ہوگی محراب..... جب تک تم
 دروازہ نہیں کھولوگی میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔“ محراب
 کی بلندآواز کے جواب میں عباد کا لہجہ دھیمّا تھا۔ تب ہی
 ککھلا تھا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو اب..... کیا رہ گیا ہے ہمارے
 ریمان..... کیوں نہیں مجھے میرے حال پر چھوڑ دیتے
 پ؟“ گیٹ کھولتے ہوئے وہ جذباتی ہوئی تھی۔ عباد
 سے ایک طرف دھکیلتے ہوئے اندر چلا آیا تھا۔

حصہ تین

نازیہ کنول نازی

محبوبہ

digest novels lovers group

اندھیرا لاکھ ہو، مجھ کو سحر کی آس رہتی ہے
یہی وہ رونی ہے جو مجھے ڈرے نہیں دین
مجھے معلوم ہے وعدہ نبھانا سخت مشکل ہے
مری کم ہمتی انکار بھی کرنے نہیں دیتی

چینیں بلند ہونے لگیں۔

چھوٹا سا تاریک اسٹور جس میں کاڑھ کیاڑ کے سوا اور
کوئی چیز دیکھائی نہیں دے رہی تھی اسے خوف زدہ
کرنے کے لیے کافی تھا۔ زارون اسے اسٹور میں بند
کرنے کے بعد لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا آیا، سرعت سے
گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور درد سے تڑپتے عباد
عبداللطیف کو اپنے مضبوط بازوؤں میں سنبھالتا، گاڑی کی
پچھلی سیٹ پر پھینک دیا تھا۔

”میں چاہتا تو ایک ہی گولی میں تمہارا کام تمام کر سکتا
تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا، پتہ ہے کیوں؟ کیونکہ تم اپنے
باپ کے اکلوتے بیٹے ہو، اس بڑھاپے میں اپنے سگے چچا
کو بے موت مرتے نہیں دیکھ سکتا میں، لیکن اس کا یہ
مطلب ہرگز مت سمجھنا کہ اگلی بار محراب تک پہنچنے کی
تمہاری غلطی میں آسانی سے معاف کر دوں گا، سمجھ گئے
ناں، شاہاش، دور رہنا اب محراب سے۔“ جھک کر تنبیہی
لیجے میں کہتا وہ اسے زہر لگا مگر تکلیف اتنی تھی کہ فی الحال
وہ اسے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

جسم سے خون تیزی سے بہنے کی وجہ سے اس پر
غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ زارون اسے پچھلی سیٹ پر آرام
سے لٹا کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ اگلے پندرہ منٹ

وہ دیوار کے ساتھ لگی بیٹھی تھی جب وہ دھاڑتا ہوا اندر
داخل ہوا۔ سرخ انگارہ آنکھوں میں جیسے خون سوار تھا۔
محراب کا شدت سے دھڑکتا دل یکنخت ساکت ہوتا ہاں ہم
زارون نے اس کی خوف زدہ آنکھوں میں نہیں دیکھا
تھا۔ شدید غصے کی حالت میں کمرے میں داخل ہوتے ہی
وہ کسی عقاب کی طرح اس پر چھٹا تھا۔

”بذات، بدکردار، بے غیرت لڑکی، کہا تھا ناں تم سے
کہ تم صرف میری ہو..... میری ضد، میری پسند ہو، نہیں
وہ بدکردار ہو سکتا میں تم سے، کیا کیا نہیں کیا تمہارے حصول
کے لیے میں نے اور تم ہو کہ پھر بھی نقب لگانے پر تلی ہوئی
ہو، کس مٹی کی بنی ہو تم؟“ حلق بھاڑ کر چلاتے ہوئے اس
نے اس پر پھپھروں کی بارش کر دی تھی۔ محراب چلانے لگی۔
”چھوڑو مجھے..... نفرت کرتی ہوں میں تم سے۔“
”کرتی رہو، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ تنک کر کہتے
ہوئے وہ اسے بازو سے کھینچتا بیڈروم سے باہر لے آیا
تھا۔

”تم جیسی عورت پر اعتبار کا مطلب ہے خود اپنے
ہاتھوں اپنی قبر کھودنا، اب جب تک میں تمہارا کہیں
بندوبست نہیں کر دیتا، مرو نہیں پر۔“ چھوٹے سے اسٹور
میں اسے بند کرتے ہوئے وہ جنونی ہو رہا تھا۔ محراب کی

بچگی اس کا آپریشن ہو چکا تھا۔ زارون کو وہاں موجود کچھ
کر سردار عبداللطیف کو سارا معاملہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی
خون جیسے ان کی رگوں میں اگلنے لگا تھا۔

”کیا ہوا ہے میرے بیٹے کو؟“ خشمگین لگا ہوں سے
اسے گھورتے ہوئے انہوں نے پوچھا جب کہ وہ کمال
بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہوا۔

”کچھ نہیں، تین گولیاں لگی ہیں مگر بے فکر رہے زندہ
بچ جائے گا۔ ڈاکٹر نے گولیاں نکال کر خون چڑھا دیا
ہے۔“

”اسے گولیاں مارنے کی ہمت کس نے کی؟“
”کون کر سکتا ہے؟ ظاہر ہے جسے اس سے مسئلہ ہوگا
وہی ہمت کرے گا۔“

”تم اب اپنی حد پار کر رہے ہو زارون۔“
”نہیں..... نہیں جا جا جان، حد پار کرتا تو اس وقت
حویلی میں جچی جان کی جینیں گونج رہی ہوتیں اور آپ کے
کندھے ٹوٹ گئے ہوتے مگر میں نے ایسا نہیں کیا، فی

کے بعد وہ قریبی ہاسپٹل میں اپنے ایک دوست کی توسط
سے اس کے بڑے بھائی کے سامنے کھڑا تھا جو سرجن
تھے۔

”عامر بھائی، فوری آپریٹ کا بندوبست کریں، کزن
ہے میرا، تین گولیاں لگی ہیں جسم میں، خون تیزی سے بہہ
رہا ہے مگر خون کی فکر نہ کریں، میرا اور اس کا بلڈ گروپ
ایک ہے۔ جتنی چاہیے اتنی بوتلیں دینے کے لیے تیار
ہوں مگر اسے کچھ ہونا نہیں چاہیے پلیز۔“ اس کا دوست
چونکہ پہلے ہی اپنے بھائی سے بات کر چکا تھا لہذا بناء
پولیس کو ملوث کیے عباد کے فوری آپریٹ کا بندوبست
ہو گیا تھا۔

عباد کے جسم میں تین گولیاں پوست تھیں۔ ایک
دائیں ٹانگ میں، ایک بائیں کندھے پر اور تیسری پیٹ
میں۔ زارون عبدالرحیم نے اسے ہاسپٹل پہنچانے میں
دیر نہیں کی تھی مگر خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا۔ سردار
عبداللطیف اور حویلی کے دیگر افراد تک جس وقت یہ خبر



”کون ہے وہ مرد جو آپ کو گھسیٹ کر یہاں لا رہا تھا؟“ گفتگو کا آغاز ہوا۔

محراب نے آنسوؤں سے بھیگا چہرہ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے صاف کیا۔

”شوہر ہے میرا۔“

”اوہ مجھے اندازہ تھا شوہر ہی ہو سکتا ہے، کیا زبردستی کی شادی ہے؟“

”ہوں۔“

”پڑھی لکھی ہو؟“

”ہوں۔“

”کتنا پڑھی ہو؟“

”گریجویشن کیا ہے پرائیویٹ۔“

”آگے کیوں نہیں پڑھا؟“

”اجازت نہیں ملی؟“

”کس سے..... کیا شوہر سے؟“

”نہیں بڑے تایا سے۔“

”کیوں انہیں کیا مسئلہ تھا؟“ وہ حیران ہوئی۔ محراب ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

”بہت لمبی کہانی ہے یہ، کبھی فرصت میں سناؤں گی، اس وقت تو آپ کی شکر گزار ہوں آپ نے میری مدد کی۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے، اصل میں کل رات میں بہت شینس تھی۔ اسی لیے سڑک پر ٹہل رہی تھی تب ہی اچانک میں نے آپ کے گیٹ کے سامنے ایک گاڑی رکتے اور اس میں سے ایک ہنڈسم سے مرد کو باہر نکلتے دیکھا مجھے وہ غصے میں لگ رہا تھا۔ ابھی چند منٹ بھی نہیں گزرے کہ اس نے اس گھر سے نکلتے ایک دوسرے خوبو مرد کو بے دروی سے مارنا شروع کر دیا مارتے مارتے اچانک پتہ نہیں کیا ہوا کہ اس نے گاڑی سے پٹل نکال لیا اور یکے بعد دیگرے اسے تین گولیاں مار دیں، بعد میں اسی موڑ اور غصے کے ساتھ وہ اندر چلا گیا، میں بہت ڈر گئی تھی۔ مانو اپنی جگہ سے ہلنے کی ہمت بھی

الجال اسے اپنی عزت کی طرف میلی نظر سے دیکھنے کی سزا دی ہے۔ دوبارہ اگر اس نے ایسی جرات کی تو نہ آپ کو یہاں ڈاکٹر کے پاس آنے کی زحمت کرنی پڑے گی نہ مجھے آپ کو اس کے متعلق کوئی خبر دینے کی، یاد رکھئے گا۔“ وہ ان سے خائف ہونے کی بجائے نہایت دیدہ دلیری سے دھمکی دینا وہاں سے نکل گیا تھا۔

سردار عبداللطیف چیخ و تاب کھاتے بس مٹھیاں بچپتے رہ گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

تنگ دتار یک اسٹور میں چیخ چیخ کر اس کا گلا خشک ہو گیا تھا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

زارون عبدالرحیم اسے وہاں قید کرنے کے بعد گویا اس سے غافل ہو چکا تھا۔ صبح کی سپیدی ہلکی ہلکی نمودار ہو چکی تھی تب ہی اس کے کانوں نے پٹل ہل کی ٹنگ سنی۔ نیم مردار وجود میں گویا دوبارہ زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ سرعت سے اٹھ کر اس نے زور زور سے دروازہ پھینکا شروع کر دیا تھا۔ جواب میں کچھ بھی سیکنڈز کے بعد ہلکی سی کلک سے دروازہ کھل گیا تھا۔

سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے پرسوں رات اس نے روتے ہوئے ایسولینس کے پیچھے بھاگتے دیکھا تھا۔ وہ بھلا یہاں کیا کر رہی تھی؟

لڑکی نے شاید اس کی آنکھوں میں ابھرتی حیرانی بھانپ لی تھی تب ہی اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

”میرا نام آثرہ ہے، یہ سامنے والی بلڈنگ میں رہتی ہوں، کل رات سے آپ کے لیے بہت خوف زدہ ہوں، بہت خونی منظر دیکھا آپ کے گھر کے باہر، ایک روز کسی مرد کو آپ کا بازو گھسیٹ کر یہاں لاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ پوری رات آپ کے باری میں سوچ سوچ کر سو نہیں سکی۔“ اس نے اپنی وہاں موجودگی کی وضاحت پیش کی۔ محراب نے جھپکتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”عباد سائیں کیا ہیں؟“ اس کے سوال نے اسے مزید تپا دیا۔ تب ہی خشکیں نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔

”وہ جہاں بھی ہو تمہیں اس سے مطلب؟“

”میری محبت ہیں وہ۔“ اپنی پوری ہمت جمع کر کے اس نے کہا۔ جواب میں وہ چونک کر اسے دیکھتے ہوئے ہنس پڑا۔

”اچھا؟ اسی لیے میری چھوٹی سی پلاننگ پر بناء کچھ سوچے سمجھے طلاق دے ماری تمہارے منہ پر؟“

”شٹ اپ.....“

”شٹ اپ کی بجی آخری بار وارن کر رہا ہوں تمہیں زندگی کی آخری سانس تک میرے سوا تمہاری زبان سے اور کسی مرد کا نام نہ سنوں میں، ورنہ اتنا برا کروں گا تمہارے ساتھ کہ بھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا تم نے۔“ اسے گدی سے پکڑ کر اپنے قریب کرتے ہوئے گویا اس نے دھمکی دی۔ محراب ان آنکھوں کی وحشت دیکھتی رہ گئی۔

”چلو اب کھانا پکاؤ بھوک لگی ہے۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا اوپر سے دو بوتلیں خون کی نکلوائی ہیں جسم سے۔“ اگلے ہی پل وہ دھوپ سے چھاؤں بن گیا تھا۔

”چلو شاباش جلدی کرو۔ تب تک نہا کر آتا ہوں میں۔“ اس بار اس کا گال تپتے پھرتے ہوئے وہ کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

محراب ٹوٹے اعصاب کے ساتھ شکست خوردہ ہی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ وہ نہا کر آیا تو وہ کچن ٹیبل پر بیٹھی پیاز کاٹ رہی تھی۔

”شاباش ہے تمہیں، ابھی تک پیاز ہی کاٹ رہی ہو، میں سمجھا کھانا ٹیبل پر لگ چکا ہوگا۔“ وہ نہانے میں اچھی خاصی دیر لگتا تھا۔ تب ہی غصہ ہوا۔

محراب نے ایک نظر اسے دیکھا پھر سر جھکاتے ہوئے بولی۔

”روٹی پکا کر رکھ دی ہے، پلاؤ دم پر ہے، سالن میں

نہیں بچی تھی مجھ میں پھر میرے دیکھتے دیکھتے وہ تین چار منٹ کے بعد اکیلا باہر نکل آیا، میں بھی شاید اس نے آپ کو مار دیا ہے۔ بعد میں وہ اس زخمی شخص کو خود بھی اٹھا کر گاڑی میں ڈال کر یہاں سے چلا گیا۔ میں ساری رات آپ کے بارے میں سوچ کر پریشان ہوتی رہی کہ جانے آپ کس حال میں ہوں گی۔ رات تو جیسے تیسے گزر گئی مگر صبح ہوتے ہی میں خود کو یہاں آنے سے نہیں روک سکی۔“ اپنی وہاں موجودگی کی مکمل وضاحت دیتے ہوئے اس نے محراب کا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کی۔ وہ سر جھکا گئی۔

”آپ ٹھیک ہیں ناں؟“

”ہوں۔“

”گڈ، میں یہیں سامنے رہتی ہوں، کوئی بھی مسئلہ یا پریشانی ہو آپ کسی بھی وقت بلا جھجک مجھے مدد کے لیے پکار سکتی ہیں۔ ان شاء اللہ جتنا ہو سکا آپ کی مدد کرنے کی کوشش کروں گی۔“

”بہت شکریہ۔“ اس وقت وہ اتنی خوف زدہ اور غائب دماغ تھی کہ چاہتے ہوئے بھی اس سے کوئی بات نہیں کر پار ہی تھی۔

آئزہ نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی تب ہی اسے بناء مزید کریدے وہاں سے پلٹ گئی۔ اس کے جاتے ہی محراب پر پھر جیسے خوف غلبہ پانا شروع ہو گیا۔

”کیا ہوا ہوگا؟ عباد عبداللطیف زندہ ہوگا یا نہیں۔“ یہ سوال کسی زہر یلے ناگ کی طرح بار بار ان کے اعصاب کو ڈس رہا تھا۔

صبح سے دوپہر ہو گئی تھی وہ وہیں اسی پوزیشن میں گم صم سی بیٹھی رہی۔ زارون ہسپتال سے سیدھا گھر آیا تھا۔ اسے لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا دیکھ کر ہلکا سا ہنسا۔

”تمہیں بھی رات اسٹور میں بند کر کے گیا تھا پھر تم باہر کیسے نکلیں؟“ اس کا غصہ پھر عود آیا۔ محراب اس بار بے خوف رہی۔ بچا بھی کیا تھا اب کھونے کے لیے؟ نہ عزت نہ محبت۔

”یہ جو سامنے والی بلڈنگ میں لڑکی ہے اس سے بھی زیادہ میل میلاپ بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے، وہاں بھی کوئی مسئلہ ہو جائے یا میں جلدی گھرنا سکوں تب مدد لے سکتی ہو۔“ وہ شخص جیسے اس گھر میں ہونے والی ہر آہٹ سے واقف تھا۔

محراب کہاں جانتی تھی کہ مین گیٹ سے لے کر اس کے بیڈروم تک میں سی سی وی کیسیر لگا تھا تا کہ وہ اس کی ہر حرکت پر نظر رکھ سکے۔ تب ہی سامنے والی لڑکی کے ذکر پر چونک اٹھی تھی۔ زارون اس کی حیرانی پر مسکرا دیا۔

”زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے، یہاں موجود نہ ہو کر ہی تمہاری ہر حرکت کی خبر ہوتی ہے مجھے، بہر حال کھانا اچھا پکاتی ہو تم، ماننا بڑے گا۔“ ہاٹ پاٹ سے روٹی نکالتے ہوئے وہ اسے مسلسل حیران کر رہا تھا۔ وہ پلیٹ میں رکھے چاولوں سے کھیلتی رہی۔

”ایک پتے کی بات بتاؤں تمہیں جو کسی ریاست کو فتح کرتا جانتا ہے ناں، اسے اس کی حفاظت کرنا بھی آتی ہے۔“ پہلی بار وہ اتنا بول رہا تھا۔ شاید کل رات میں وحشت کا اس نے مظاہرہ کیا تھا اس کا مدادہ کرنے کی بھونڈی کوشش تھی یہ۔ وہ اب بھی خاموش بیٹھی رہی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلتا ہوں اب کھانا کھا لینا اچھی طرح، رات میں کوشش کروں گا جلدی آ جاؤں۔“ ڈائننگ ٹیبل سے اپنا موبائل اٹھاتے ہوئے اس نے پیشگی اطلاع دی پھر چند لمحوں کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد واپس پلیٹ گیا۔

محراب اس کے جاتے ہی ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ گئی۔ دل تھا کہ بے حد بوجھل ہو رہا تھا۔ عباد عبد اللطیف کے بارے میں سوچ سوچ کر اس نے اپنے اعصاب تھکا لیے تھے۔ نہ پاس کوئی فون تھا نہ موبائل فون کیسے اس کے بارے میں پتہ کرتی، کس سے پوچھتی کہ وہ کس حال میں ہے۔ گزرتا ایک ایک لمحہ جیسے اس کے لیے پل صراط ثابت ہو رہا تھا۔

بھی زیادہ دیر نہیں ہے۔ یہ پیاز سلاد کے لیے کاٹ رہی ہوں۔“

”ہوں، چلو پھر کھانا لگاؤ ٹیبل پر مجھے کہیں جانا ہے۔“ کچی پیاز اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے اس نے نیا حکم جاری کیا۔

محراب نے پیاز وہیں چھوڑ کر ڈش میں چاول نکالے، ساتھ میں ہاٹ پاٹ اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔ سلاد تقریباً تیار تھی، فرنیج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل بھی نکال لی، مرغی کا گوشت تھا پکنے میں زیادہ ٹائم نہیں لگا تھا لہذا بوٹی چیک کر کے ڈونگے میں سالن بھی نکال لیا۔

”آ جاؤ تم بھی کھالو، پتہ نہیں کب سے نہیں کھایا ہو گا۔“ ڈائننگ ٹیبل پر اپنی سیٹ سنبھالنے کے بعد ڈونگے کا ڈھکن اٹھاتے ہوئے اس نے پھر اسے مرچیں لگائیں مگر وہ خاموش رہی۔

”کب تک سوگ مناؤ گی اس فضول سے انسان کا، مرا نہیں ہے ابھی بچ گیا ہے بے فکر ہو کر کھانا کھاؤ۔“ اس کی خاموشی نے اسے زچ کیا مگر محراب کھڑی رہی۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”بھوک نہیں ہے تب بھی کھانا کھاؤ میں جو کہہ رہا ہوں۔“ وہ جب ضد پرا جاتا تو پھر اس کے لیے پیچھے ہٹتا آسان نہیں رہتا تھا۔ محراب نے ایک نظر سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر چپ چاپ بیٹھ گئی۔ زارون اب اپنی پلیٹ میں چاول نکال رہا تھا۔

”جانتا ہوں میں بہت خواب دیکھے ہوں گے تم نے عباد عبد اللطیف کے ساتھ زندگی گزارنے کے مگر وہ شخص تمہارے لائق نہیں ہے، بودا شخص ہے بودا جبکہ تمہارے شریر کو فواد دی ہونا چاہیے تا کہ وہ تمہاری حفاظت کر سکے مجھے سزا زمانہ کہتا رہے تم بدکردار ہو پھر بھی کبھی تمہیں چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ بھروسہ کرتا ہوں تم پر۔“

پلیٹ میں چاول نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے گویا اس کا دل صاف کرنے کی کوشش کی۔ محراب پھر خاموش رہی۔

اعتماد کا چھرا گھونپ کر تم نے اس کو ساری دنیا کی نظروں میں گناہ گار کر دیا، صرف تمہاری وجہ سے، تمہارے اس عیاش عاشق نے میری بے گناہ مصوم بہن کی بے رحم موت کا پلان بنایا، صرف تمہاری وجہ سے میرے پاک دامن پر تہمت لگی اس کے باوجود کتنی ڈھٹائی اور بے حیائی سے تم پھر میرے سامنے چلی آئیں، شرم نہیں آتی تمہیں؟

”نہیں۔“ اس کے چلانے پر ہنسی سے اپنا ہانڈ اس کی گرفت سے نکالتے ہوئے اس نے نہایت سکون سے نفی میں سر ہلایا۔

”اپنی غلطی کی تصحیح کر لو، یہ جو سامنے شخص کھڑا ہے ہاں تمہارے، صرف عاشق نہیں ہے میرا، شوہر بھی ہے۔ باقاعدہ نکاح کیا ہوا ہے ہم نے، سمجھاؤ آئی تمہیں، تو اپنے شوہر کے ساتھ، کبھی بھی کہیں بھی جانے میں کیسی شرم ہوں؟“ کوئی پہاڑ تھا جو اس وقت محراب عبدالمکریم کے سر پر ٹوٹا تھا۔

پھٹی پھٹی سی بے یقین نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے وہ گویا چکرا کر رہ گئی۔ تب ہی زارون نے اس سے کہا۔

”تم جاؤ کمرے میں، بعد میں بات کرتا ہوں تم سے۔“

”کیا بات کرو گے اب تم مجھ سے؟“ زارون کی بات نے گویا اسے تپا دیا تھا۔ تب ہی وہ چلائی گئی۔

”تمہارا اس لڑکی کے ساتھ جائزہ دینا تو بتا دیجے ہاں سب کو، وہ تو زودتی مٹنی، ہٹ جاتی تمہارے راستے سے، اسے بے خبر رکھ کر، حویلی کے سرداروں سے اپنی اصلیت چھپا کر تم سمجھتے ہو بڑی بہادری کا کام کیا تم نے، نف ہے تمہاری مردانگی پر۔“

”سٹاپ۔“ اس وقت محراب کا چلانا اسے طیش دلا

گیا۔

”چلو کمرے میں۔“ بجائے غزالہ کو کچھ کہنے کے اس نے محراب کا بازو پکڑا اور اسے کھینچتے ہوئے کمرے میں

زارون نے یہ تو بتا دیا تھا کہ وہ زندہ ہے مگر کس حال میں ہے یہ نہیں بتایا تھا۔ دن اسی اضطراب کی کیفیت میں کٹ گیا تھا۔ شام ڈھلی پھر رات آ گئی۔ زارون نے کہا تھا وہ جلدی آ جائے گا، اسی اطمینان میں جانے کب بستر پر لیٹے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ رات کا نچانے کو سا پہر تھا جب ہلکی سی کھٹ پٹ کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

کمرے میں اس کے سوا کوئی نہیں تھا یکفخت اس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ سر ہانے پڑا دوپٹا اٹھا کر اچھی طرح سر پر جماتے ہوئے وہ کمرے سے باہر آئی تو سامنے لاؤنج میں جو منظر دیکھائی دیا اس نے بے ساختہ اسے ٹھٹھک کر وہیں فریز ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

زارون گھرا آچکا تھا مگر اکیلا نہیں آیا تھا اس کے ساتھ غزالہ نامی وہ لڑکی بھی تھی جس نے مدر سے میں اس کا اعتماد جیت کر پھر دوستی کے نام پر چھرا گھونپا تھا اس کی پیشہ میں۔ نظر کے بالکل سامنے وہ صوفے پر بیٹھی تھی اور زارون عبدالمکریم اسے جائے بنا کر پیش کر رہا تھا۔

جانے کیوں اس لمحے اس لڑکی کو وہاں دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور بتاؤ زارون کی موجودگی کا خیال کیے کسی چیل کی طرح جھپٹ کر اس نے اس کا بازو جکڑ لیا تھا۔

”مکار، جادو مگرنی، یہاں بھی پہنچ گئیں تم؟ شرم نہیں آتی رات کے اس پہریوں بے حیاءوں کی طرح کسی کے گھر کا رخ کرتے ہوئے۔“ وہ چلائی۔

غزالہ نے اس کے رد عمل پر قدرے حیران ہو کر زارون کی طرف دیکھا۔

”تم نے بتایا نہیں کہ اسے بھی یہاں رکھا ہوا ہے۔“

”مجھ سے بات کرو۔“ زارون کے کچھ کہنے سے پہلے بھی وہ چلائی۔

”شرم نہیں آتی تمہیں آدمی رات کو یوں کسی کے شوہر کے ساتھ کسی دوسری عورت کے گھر میں نقب لگاتے ہوئے، دوسری عورت بھی بھلا کون؟ جس کی پیٹھ میں

”بس چپ۔“ تیز قدموں سے بیرونی گیٹ کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے اس نے تنبیہ کی تو غزالہ اپنے گال پیٹ کر رہ گئی۔

”کیا ہو جاتا ہے ایک دم سے اچانک تمہیں؟ بالکل اجنبی ہو جاتے ہو تم۔“ بمشکل بھاگ کر وہ اس کے تیز قدموں کا ساتھ دے پائی تھی۔

زارون نے چپ چاپ گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ غزالہ برابر والی سیٹ پر بیٹھی تو اس نے فوراً گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔ تب ہی اپنی توجہ سامنے روڈ پر مرکوز رکھتے ہوئے وہ بنا اس کی طرف دیکھے بولا۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تم سے نکاح میں نے صرف اپنی عزت بچائے رکھنے کے لیے مجبوری میں کیا تاکہ اپنے بابا اور بھائیوں کے سامنے نکاح نامہ پیش کر کے معتبرہ سکوں، انہیں یقین دلا سکوں کہ میرا کسی بھی لڑکی کے ساتھ کوئی ناجائز تعلق نہیں ہے مگر پہلی بار اپنی پلاننگ میں کامیاب نہیں ہوا میں، بہر حال جو ہوا سو ہوا اب تمہارے حق میں یہ بہتر ہے کہ تم اس نکاح کو کسی گولڈ میڈل کی طرح گلے میں لٹکا کر سارے زمانے میں میری مشکوہ ہونے کا اشتہار مت لگاتی پھرنا، محراب کو بتا دیا کافی ہے، کسی اور کو اگر اس راز کے بارے میں آگاہ کیا تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں اسی لمحے، اسی پل یہ تعلق توڑ دوں گا، میرے غصے سے اچھی طرح واقف ہو تم۔“

”ہاں بہت اچھی طرح واقف ہوں مگر تم بھی یہ جان لو کہ میں کوئی کلنگ کا ٹیکہ نہیں ہوں جسے ماتھے پر سجانے سے خوف آ رہا ہے تمہیں۔“ اسے شاید اس کی تنبیہ بری لگی تھی تب ہی غصے سے بولی تو وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔

”جب تک اس نکاح کو خفیہ رکھو گی تب تک کلنگ کا ٹیکہ نہیں بنو گی کیونکہ میں جس خاندان سے تعلق رکھتا ہوں اس خاندان میں کسی بھی باہر کی لڑکی سے نکاح کا مطلب ہے اپنی برادری اور اس کی روایات سے انحراف کرنا، بابا جان زندہ ہوتے اور بات تھی، اب میری وہ حیثیت نہیں

لے آیا۔“

”نی الوقت تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ تم چپ کر کے سو جاؤ۔“

”کیوں؟ تاکہ تم اس کے ساتھ اپنی رات رنگین کر سکو، یہی کرنا تھا تو میری زندگی برباد کیوں کی، کیوں میرے اور عباد سائیں کے راستے جدا کیے، تم کتنا گرو گے زارون عبدالرحیم، کتنا گرو گے تم؟“ وہ رو پڑی۔ زارون لب بھینچ کر رہ گیا۔

”اس کے ساتھ نکاح تمہیں اپنے نکاح میں لینے کے بعد کیا ہے، وہ بھی اس لیے کیونکہ تمہارے عاشق عباد صاحب نے میرے بابا اور بھائیوں کو میرے سارے پرانے کارناموں کے بارے میں بتا دیا تھا۔ خود کو اپنے بابا اور بھائیوں کی نظر میں معتبر رکھنے کے لیے مجبور آیا نکاح کیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا، بابا اور بھائیوں کی نظروں میں اپنی پارسائی کا ثبوت پیش کرنے سے پہلے ہی اپنے باپ کو کھو دیا میں نے، جو زخم اس وقت میرے دل پر لگا ہے اس کی تکلیف تم نہیں جان سکتیں اس لیے بہتر یہی ہے کہ چپ رہو، خواہ مخواہ چیخ چیخ کر اپنا اور میرا تماشا مت بناؤ جھنجھیں؟“ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے اسے اپنے کسی عمل کی وضاحت دی تھی۔ مجرا گال پونچھ کر رخ پھیر گئی۔

”تم جیو یا رو میری بلا سے جہنم میں جاؤ۔“ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے وہ پلٹ گئی تھی۔ زارون بمشکل غصہ کنٹرول کرتا کرے سے نکل آیا۔

”چلو۔“ لاؤنج میں غزالہ کے مقابل آتے ہی اس نے حکم صادر کیا تو وہ چونک اٹھی۔

”کہاں؟“

”تمہارے گھر چھوڑ آنا ہوں اور کہاں۔“

”مگر کیوں؟ تم نے کہا تھا تم آج رات میرے ساتھ رہو گے۔“

”ہاں کہا تھا مگر اب میں ہی کہہ رہا ہوں چلو تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آنا ہوں۔“

”زارون۔۔۔۔۔“

رہی ہے، اب میں اپنی کسی بھی غلطی کا دفاع نہیں کر سکتا۔“ وہ اسے سمجھا رہا تھا مگر غزالہ نے سنی ان کی کر کے بات ہوا میں اڑادی۔

اسے اس لمحے زارون عبدالرحیم پر بے حد غصہ آ رہا تھا جو اپنی بات سے پھر گیا تھا۔ وہ گھر آیا تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ غزالہ کو اس نے اس کے گھر کے باہر ہی ڈراپ کر کے گاڑی ریورس کر لی تھی۔

نیند اس وقت آنا چونکہ ممکن نہیں تھا لہذا وضو کر کے پہلے اس نے نماز پڑھی پھر بناؤ مخراب کی نیند خراب کیے وہیں لاؤنچ میں صوفے پر سو گیا۔

مخراب بھٹی شریانوں کو دونوں ہاتھوں سے سہلاتی کرے سے باہر آئی تو سامنے ہی اسے صوفے پر آڑا ترچھا پڑا دیکھ کر ہنسی گئی۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا کوئی چیز اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے تاکہ اس سے ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جائے مگر پھر صبر کے گھونٹ پیتی نظر انداز کر کے خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ زارون کی آنکھ کھٹ پٹ کی آواز پر کھلی تھی۔

مخراب کو بچن میں دیکھ کر اس نے مزید سونے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ مخراب اپنے لیے چائے کپ میں انڈیل کر ابھی پلٹ ہی رہی تھی جب وہ آنکھوں میں نیند کا خمار لیے اس کے سامنے آ گیا۔

”واہ..... تمہیں کیسے پتہ مجھے اس وقت چائے کی طلب ہو رہی تھی۔“ نہایت ڈھٹائی سے کپ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے وہ بولا تو مخراب تلملا کر رہ گئی۔

”میری چائے ہے یہ۔“ خونخوار نگاہوں سے اسے گھورتی وہ غصے سے بولی جب زارون نے کپ سے بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے کپ واپس اس کی طرف بڑھا دیا۔

”اوہ سوری، میں سمجھا شاید میرے لیے بنائی ہے تم نے۔“ اسے مزہ آتا تھا اسے چڑانے میں۔ مخراب کا بس نہ چلتا تھا اسے کچا چبا جاتی۔

”ویسے میں تو سمجھتا تھا تم کھانا بھی اچھا بناتی ہو مگر

ابھی پتا چلا تم تو چائے بھی بہت اچھی بناتی ہو واہ۔“ وہ شخص اتنا بے حس تھا کہ اس وقت اسے اس کے احساسات و جذبات کی بھی قطعی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

بے بس سی پلٹ کر وہ اپنے لیے دوبارہ چائے بنانے لگی تھی۔ جب وہ ڈائننگ ٹیبل سے کرسی نکال کر وہیں بیٹھ گیا تھا۔

”کیا پکا رہی ہو آج کھانے میں؟“

”تمہارا سر۔“ چائے کا ڈبا غصے سے چٹختے ہوئے اس نے جواب دیا تو وہ مسکرا دیا۔

”ہاں میرا سر کھانے کی بہت شوقین ہوں۔“

”میں نفرت کرتی ہوں تم سے۔“ اس بار وہ مزید ضبط نہیں کر سکی۔ زارون کے مسکراتے لب سمٹ گئے۔

”جانتا ہوں بار بار یاد دہانی کروانے کی ضرورت نہیں۔“

”جانتے ہو تو جاؤ پھر یہاں سے، خوش رہو میرے اعدا۔ اب پر سواری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کس بات کا اتنا غرور اور گھمنڈ ہے تمہیں، مت بھولو کہ تمہیں ذلت کی موت سے بچایا ہے میں نے۔“ اس کے اندر کے خون نے اسے اس سے زیادہ برداشت کی اجازت نہیں دی تب ہی وہ اٹھ کر اس کا بازو اپنی گرفت میں جکڑ کر بولا تو مخراب کی چیخ نکل گئی۔

”ذلت کی موت میں دھکیلنے والے بھی تمہی تھے۔“ وہ چلائی تو زارون کا غصہ مزید بڑھ گیا۔

”کون جانتا تھا یہ اس وقت، اگر میں اپنے بابا کو یہ روکتا تو اس وقت اندھیری قبر میں پڑی چیخیں مار رہی ہوتی تم۔“

”تمہیں کیا لگتا ہے اب کیا کر رہی ہوں میں، تمہارا گھر کسی قبر سے کم نہیں ہے میرے لیے۔“ وہ آسانی سے زیر ہونے والوں میں سے نہیں تھی۔ زارون نے تنفر سے اسے پرے دھکیل دیا۔

”جہنم میں جاؤ تم۔“ کرسی کو زبردست ٹھوکر کر سید کرنا

محراب نے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے اپنے آنسو خشک کر لیے۔ زندگی اس کے لیے آسان پہلے بھی نہیں تھی اب تو اور بھی مشکل ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

کوئی زنجیر ہو چاہت کی چاندی کی روایت کی محبت توڑ سکتی ہے

یہ ایسی ڈھال ہے جس پر

زمانے کی کسی تلوار کا سکہ نہیں چلتا

اگر چشم تماشا میں ذرا سی بھی ملاوٹ ہو

یہ آئینہ نہیں رہتا

یہ ایسی آگ ہے جس میں

بدن شعلوں میں جلتے ہیں تو روحیں مسکراتی ہیں

یہ وہ سیلاب ہے جس کو

دلوں کی بستیاں آواز دے کے خود بلاتی ہیں

یہ جب چاہے کسی بھی خواب کو تعبیر مل جائے

دعا جو بے ٹھکانہ ہو اسے تاثیر مل جائے

کسی رستے میں رستہ پوچھتی تقدیر مل جائے

محبت روک سکتی ہے سسے کے تیز دھارے کو

کسی جلتے شرارے کو

خفا کے استعارے کو

محبت روک سکتی ہے کسی گرتے ستارے کو

یہ چکنا چور آئینے کی کرچیں جوڑ سکتی ہے

جدھر چاہے محبت اپنی ہاکیں موڑ سکتی ہے

کوئی زنجیر ہو اس کو محبت توڑ سکتی ہے

عباد عبد الطیف کا آپریشن کامیاب ہو گیا تھا۔ سردار

عبد الطیف کی آنکھوں میں گویا قہر کا طوفان پھٹا تھا۔

زارون کی وجہ سے ایک تو ان کے بیٹے کی زندگی پہلے

ہی برباد ہو گئی تھی اوپر سے اس لڑکے نے ان کے بڑے

بھائی کی زندگی بھی چھین لی تھی۔ وہ ابھی ان ہمد مات سے

نکل بھی نہیں پائے تھے کہ اپنی حدود کو اس کرتے ہوئے

اس نے ان کے اکلوتے لخت جگر کو گولیوں سے چھلنی

کر کے رکھ دیا۔

کامیاب آپریشن کے باوجود ڈاکٹر اس کی صرف زندگی بچا پائے تھے اسے معذوری سے نہیں بچا پائے تھے۔ اس کی وہ ٹانگ جس میں گولی لگی تھی ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو گئی تھی۔ کوئی اس لمحے ان کے دل سے پوچھتا اس پر کیا بیت رہی تھی۔ ان کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ زارون کو سامنے کھڑا کر کے گولیوں سے بھون دیتے۔

گوسر دار عبد الرحیم کے بڑے دونوں بیٹوں نے اپنے بھائی کی اس حرکت پر ان سے معافی مانگ لی تھی مگر ان کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ بدلے اور انتقام کی آگ ان کے اندر بھڑکتی سارے احساسات مسمار کر رہی تھی۔ اوپر سے زارون عبد الرحیم کو اپنی اس سفاکانہ حرکت پر کوئی شرمندگی نہیں تھی النادہ ان پر احسان جتا رہا تھا کہ اس نے ان کے بیٹے کی زندگی بخش دی۔

اب وہ اپنے قبیلے اور علاقے کے سر پرست اور سردار تھے۔ اب انہیں اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے زارون عبد الرحیم کو سبق سکھانا تھا۔

☆.....☆.....☆

عباد ہسپتال سے گھر آ گیا تھا مگر اس کی حالت دیکھنے لائق تھی۔ جب سے اسے اپنی معذوری کا پتہ چلا تھا وہ سارا سارا دن اپنے کمرے میں اندھیرہ کئے چپ چاپ لیٹا رہتا۔

سردار صاحب اور ان کی بیگم نے بہت کوشش کی اسے حوصلہ دلانے کی مگر اس کی چپ ٹوٹنے کا نام بھی نہ لیتی۔ اسے دیکھ کر ان دونوں کا دل کٹ کر رہ جاتا۔ ان کی اکلوتی بیٹی فردا کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ زارون کا کلیجہ نکال کر چبا جاتی۔

نایاب اور محراب کے ساتھ ساتھ سردار عبد الطیف کی فیملی بھی اس کی غلط حرکات سے محفوظ نہیں رہ سکی تھی اور اس کی سنگین صورت حال کا احساس زارون کے بڑے دونوں بھائیوں کو تھا۔

وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یقینی طور پر سردار عبد الطیف اب زارون کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے تب ہی

پڑ گئے ہو میرے؟“
 ”اچھی لگتی ہو دل کو، کتنی باریتاؤں۔“
 ”تمہیں تو ہر راہ چلتی لڑکی اچھی لگتی ہے اس میں خاص کیا ہے۔“

”کون سی راہ چلتی لڑکی دیکھ لی تم نے میرے ساتھ؟“
 ایک دم وہ اس کے سامنے آ گیا تھا۔ اپنے دھیان میں تیز چلتی محراب ٹھٹھک کر رکنے کے باوجود اس سے ٹکرائی۔
 ”غزالہ اور اس جیسی سینکڑوں لڑکیاں جن کا اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہو تم۔“
 ”ہا ہا ہا۔ تمہیں وہ راہ چلتی لگتی ہے؟ کروڑ پتی باپ کی اکلونی بیٹی ہے۔“

”اسی لیے مرے تم اس پر۔“
 ”تمہیں جیسی ہو رہی ہے؟“
 ”کیوں اس میں ایسی کیا خاص بات ہے جو میں اس سے جلوں؟“
 ”یہ تو تمہیں پتا ہوگا۔“

”بھاڑ میں جاؤ تم بھی اور وہ بھی۔“
 ”اور تم؟“ وہ کہاں اس کی جان آسانی سے چھوڑنے والا تھا۔ محراب تپ گئی۔
 ”میں دنیا میں ہی ٹھیک ہوں۔“
 ”یہ تو زیادتی ہے یار، تمہارے بغیر میں اکیلا بھاڑ میں کیا کروں گا؟“

”مجھے نہیں پتا۔“ اس کی سائیڈ سے نکل کر وہ کچن میں چلی آئی۔ زارون بھی پیچھے ہی چلا آیا۔
 ”ایک کپ چائے میرے لیے بھی بنا دو۔“
 ”فارغ نہیں ہوں میں۔“

”چلو پیچھے ہٹو پھر میں بنا لیتا ہوں۔“ اس کا مقصد صرف اسے تنگ کرنا تھا۔ محراب کچن سے ہی نکل گئی۔
 ”اس کا دھیان عباد عبد اللطیف میں اس کا تھا کہ جانے اس کا کیا حال ہوگا ایسے ہی زارون کی آنکھ کھلیاں اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں مگر اسے کہاں پر داکھی۔ محراب نے خود کو کمرے میں بند کر کے کمرالاک کر لیا تھا۔

انہوں نے اپنے بھائی کو محتاط رہنے کی ہدایت کی تھی۔ حویلی میں اس کا داخلہ سختی سے بند تھا۔ ان دونوں نے اسے برزور الفاظ میں تلقین کی تھی کہ وہ چند روز تک گھر سے بالکل باہر نہ نکلے سوائے کسی بہت ضروری کام کے۔ جب تک کہ وہ ارجنٹ بنیاد پر اس کی اور محراب کی بیرون ملک سکونت کا بندوبست نہیں کر دیتے۔

زارون نے انہیں یقین دلایا تھا کہ وہ ان کی ہدایت پر عمل کرے گا مگر حقیقت میں اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کی زندگی میں ڈر و خوف نام کی کوئی چیز بھی نہیں رہی تھی۔ شام ڈھل رہی تھی جب وہ گھر واپس آیا تھا۔ محراب کپڑے دھو رہی تھی اس کے دل میں نجانے کیا آئی کہ گاڑی سے نکل کر وہ سیدھا اس کے پاس چلا آیا۔
 ”میرے بھی دو سوٹ دھونے والے رکھے ہیں وہ بھی دھو دو۔“ اسے مزا آتا تھا اسے چڑانے میں اس وقت بھی یہی ہوا۔ وہ غصے میں آ گئی۔

”تو کر نہیں لگی تمہاری۔“
 ”پھر کیا لگتی ہو؟“
 ”پتا نہیں۔“ وہ اس وقت بالکل بھی اس کے منہ لگنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

زارون نے اس کے جواب پر اپنی فل بازو کے کف موڑ کر ہاتھ پانی میں ڈال دیئے۔
 ”چلو میں مدد کرتا ہوں تمہاری۔“
 ”ضرورت نہیں ہے۔“

”سدا ہر جاؤ یار، ساری عمر کیا یونہی لڑتی رہو گی؟“ پر شوق نگاہوں سے اس کا تپا تپا چہرہ دیکھتے ہوئے اس نے پانی کے چند قطرے اس کی طرف اچھالے۔ محراب تنگ ہو کر اٹھ گئی۔

”تم دھولو پہلے اپنے کپڑے میں بعد میں دھولوں گی۔“

”اکیلے کام کرنے کی عادت نہیں ہے مجھے۔“ وہ بھی اس کے پیچھے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ زچ ہوئی۔
 ”مسئلہ کیا ہے تمہاری ساتھ، کیوں ہاتھ دھو کے پیچھے

اس کا دل اس لمحے ٹوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا لہذا بیڈ کی پٹی سے ٹیک لگا کر نیچے قالین پر بیٹھی وہ چپ چاپ روتی رہی۔

نایاب عبدالکریم کے لیے۔

عباد عبداللطیف کے لیے۔

اپنی بے بس مجبور ماں کے لیے۔

اپنی بے حس، بے رنگ زندگی کے لیے۔

☆.....☆.....☆

زارون کی ایبرو ڈ جانے کی ساری تیاری مکمل ہو گئی تھی۔ اپنے طور پر زارون کے بھائی سب خفیہ رکھ رہے تھے مگر پھر بھی سردار عبداللطیف کو خبر ہو گئی تھی۔

حویلی میں ان کے وفاداروں کی بھی کمی نہیں تھی۔ زارون عبدالرحیم کے لیے وہ ایسی سزا تجویز کرنا چاہتے تھے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاش بھی نہ ٹوٹے۔ یعنی وہ اسے سزا بھی دے دیں اور ان پر الزام بھی نہ آئے۔

ابھی جمعہ جمعاً ٹھہرے تھے ان کے بھائی کو دنیا سے گئے ابھی اگر وہ سب کے سامنے یتیم بھتیجے کو نقصان پہنچاتے تو بہت ممکن تھا کہ ان کی سرداری چلی جاتی، علاقے اور قبیلے کے سرداران کی حرکت پر ان سے ناراض ہو کر بائیکاٹ کر لیتے۔ لہذا انہیں جو بھی کرنا تھا سوچ سمجھ کر کرنا تھا۔

زارون اس روز غزالہ کے ساتھ مارکیٹ آیا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ شاپنگ کی ضد کر رہی تھی اس نے سوچا چلو ایبرو ڈ جانے سے پہلے اسے خوش کروے اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اس کے ایک ایک پل پر نظر رکھے ہوئے ہے اور غزالہ اس وقت بوتیک میں کپڑے دیکھ رہے تھے جب سائیڈ سے ایک لڑکے نے غزالہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس کا بوسہ لے لیا۔

یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ غزالہ کو سمجھ ہی نہ سکا کہ اس کے ساتھ ہی نہیں تھا کہ وہ اسے سلامت جانے دیتا۔ بھاگنے کی کوشش کرتے لڑکے کو اس نے پیچھے کالر سے پکڑ کر اس کے منہ پر مکار سید کیا تھا۔ اتنے میں دو اور لڑکے

قریب ہی نکل آئے۔ وہاں بوتیک میں کسی کو بھی اصل معاملے کا پتہ نہیں چل سکا تھا کہ آخر کیا بات ہوئی ہے البتہ سب یہ ضرور جانتے تھے کہ لڑائی زارون نے شروع کی ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی صلح صفائی کی کوشش کرتا زارون نے ہسٹل نکال لی۔ ہسٹل دیکھ کر سب سائیڈ پر ہو گئے مگر اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا پیچھے کھڑے لڑکے نے اسے چلا کی سے قابو کر کے اس کی گرفت سے ہسٹل نکال لی۔ اس سے پہلے کہ زارون اسے دیکھتا غزالہ کے ساتھ بدتمیزی کرنے والے لڑکے نے اپنی پاکٹ سے ہسٹل نکال اور یکے بعد دیگرے کئی فائر زارون کی ٹانگوں پر کھول دیئے۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی اور اچانک ہوا تھا کہ کوئی بھی کچھ نہیں کر سکا۔

لڑکے اپنا کام کرنے کے بعد وہاں سے فرار ہو گئے کسی کو بھی ان کے بارے میں پتہ نہ چل سکا کہ وہ کون تھے۔

اس وقت وہاں اتنا شور اور افراتفری مچ گئی تھی کہ ان کے بارے میں جاننے کا کسی کو ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ غزالہ چیخیں مارتے ہوئے کانپ رہی تھی۔ کوئی ایسیو لنس کو کال کر رہا تھا اور کسی نے سردار عبداللطیف کو کال ملائی تھی۔

”مبارک ہو سردار صاحب آپ کا کام آپ کی ہدایت کے عین مطابق ہو گیا ہے۔“ سردار عبداللطیف نے کال سنی اور پھر اپنے کارندے کو شاباش دیتے ہوئے کال کاٹ دی۔

حویلی اور قبیلے میں جس جس کو اس حادثے اور حادثے کی وجہ کا پتا چلا ان کا خون کھول کر رہ گیا۔ وہ تعلق جو زارون نے اب تک چھپا کر رکھا ہوا تھا وہ بھی منظر عام پر آ گیا تھا۔ زارون کے بڑے دونوں بھائی ہر کسی سے منہ چھپاتے پھر رہے تھے۔

مریم بیگم خون کے گھونٹ پی کر رہ گئیں۔ ہسپتال میں زارون کے پاس غزالہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اگلے چوبیس گھنٹوں کے بعد اس کا آپریشن

کامیاب ہو گیا تھا۔ جس وقت اسے ہوش آیا سردار عبداللطیف وہیں اس کے کمرے میں موجود تھے۔ انہیں سامنے دیکھ کر زارون کو ساری کہانی سمجھ آ گئی۔ اس کی دونوں ٹانگیں بے جان تھیں وہ اذیت سے آنکھیں میچ کر رہ گیا۔ تب ہی سردار صاحب اس کے قریب آئے تھے۔ ”کیسے ہو برخوردار؟“ زارون جانتا تھا وہ اس وقت اس کے پاس کیوں آئے ہیں تب ہی خاموش رہا۔ ”لگتا ہے کچھ زیادہ ہی تکلیف میں ہو اس وقت، مگر جتنی بھی تکلیف میں ہو تمہاری تکلیف اس باپ کی تکلیف سے زیادہ نہیں ہو سکتی جس کا ایک ہی جوان بیٹا ہو اور اس کی زندگی بھی تم نے موت سے بدتر کر دی ہو۔“ اسے سوال کے جواب میں اس کی خاموشی پر انہوں نے پھر نمک پاشی کی۔

”اب تم ساری زندگی میرے احسان مند رہنا کہ جان بخش دی تمہاری میں نے وہ بھی صرف محراب بیٹی کی وجہ سے اور اس کے بعد میرا خیال ہے کہ تمہیں اب یہ بات اچھی طرح سمجھ آ جائے گی کہ شیر چاہے جتنا بوڑھا بھی ہو جائے اپنے شکار کو گھائل کرنا نہیں بھولتا۔ اب جیسی زندگی میرا بیٹا گزارے گا تم بھی ویسی زندگی ہی گزارو گے ان شاء اللہ۔“ زارون کو اب سمجھا رہا تھا کہ اس کے بھائیوں نے اسے محتاط رہنے کے لیے کیوں کہا تھا۔ کیوں وہ فوری طور پر اس کے ملک سے باہر چلے جانے پر زور دے رہے تھے۔ اس نے لاپرواہی کی اور اب اسی لاپرواہی کا خمیازہ اسے بھگنا تھا۔ سردار عبداللطیف اپنے اندر کی بھڑاس نکالنے کے بعد وہاں سے چلے گئے ان کے جانے کے بعد غزالہ اس کے پاس آئی۔

”شکر ہے ہوش آ گیا تمہیں، اب کیسی طبیعت ہے؟“

”پتہ نہیں، ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟“ وہ بیزار سی بولا۔ غزالہ اس کے قریب سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

”اچھی رپورٹ نہیں ہے زارون، ڈاکٹر کے مطابق تم اب ساری عمر اپنے پاؤں پر چل پھر نہیں سکو گے۔“

”ایبروڈ جا کر بھی نہیں؟“
”نہیں، کوئی چانس نہیں ہے۔“ وہ خود بھی بے حد مضطرب لگ رہی تھی۔ زارون کو چپ لگ گئی۔
”میرے گھر سے آیا کوئی؟“ بہت دیر کے بعد اس نے پوچھا تب وہ بولی۔

”نہیں، میں نے حویلی اطلاع بھجوا دی تھی مگر پھر بھی کوئی نہیں آیا۔“

کوئی نشتر تھا جو اس وقت زارون کے اندر پیوست ہوا تھا۔ پہلی بار اسے تنہائی بہت زیادہ محسوس ہوئی تھی۔ بہت دیر تک اس سے کچھ بولا بھی نہیں گیا تب ہی غزالہ بولی۔
”تم اپنی وائف کو یہاں بلاؤ، میں کل سے یہیں ہوں میرے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔“ وہ اب معذور ہو گیا تھا تو اس رئیس لڑکی کے لیے بھی اس کی اہمیت صفر ہو گئی تھی۔

زارون چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ بالکل خالی سپاٹ لگا ہوں میں جیسے ڈھول اڑ رہی تھی۔

”ہوں۔“ خالی دماغ کے ساتھ اس کا سر آہستہ سے اثبات میں ہلاتا تھا۔

”ٹھیک ہے..... میرا گھر دیکھ رکھا ہے تم نے، اسے خبر کر دینا۔“ اس وقت وہ یہی کہہ سکا۔

غزالہ اسی کو غنیمت سمجھتے ہوئے فوراً وہاں سے نکل گئی۔ اس کے وہاں سے نکلتے ہی جو پہلا خیال زارون کے دماغ میں آیا وہ خود کشی کا تھا۔ بچپن سے اب تک اس نے ایک بھر پور زندگی گزاری تھی اب اسے یہ محتاجی اور خود ترسی کی زندگی گواہ نہیں تھی۔

اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے عباد عبداللطیف کے ساتھ کتنا غلط کیا تھا مگر اب اس احساس کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا تھا۔

اب اسے محراب عبدالکریم کو خود پرستے ہوئے نہیں دیکھنا تھا۔ کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی، وہاں کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس سے وہ خود کو نقصان پہنچا سکتا۔ اسے

ڈرپ لگی تھی اس نے وہ فوج کراتا ردی۔ نرس کمرے میں آئی تو اسے اس حال میں دیکھ کر پریشان ہو گئی۔
”مسٹر زارون آپ ٹھیک ہیں؟“

”نہیں اور اب دفع ہو جاؤ یہاں سے میں مزید کوئی سوال نہ سنوں۔“ ایک لمحے میں وہ کنٹرول سے باہر ہوا تھا۔

نرس انہی قدموں پر واپس پلٹ گئی۔ اگلے پانچ منٹ کے بعد ڈاکٹر فرحت اس کے پاس آئے تھے۔

”السلام علیکم۔“ کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے سلام کیا۔

زارون نے سلام کا جواب دیا نہ نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھنے کی زحمت کی۔ تب ہی وہ اس کے قریب چلتے آئے۔

”ڈرپ کیوں اتا ردی آپ نے؟“
”ضرورت نہیں تھی۔“ آنکھیں موندتے ہوئے اس نے سر پیچھے تکیے سے ٹکایا۔ تب ہی وہ بولے۔

”یہ طے کرنا کہ ضرورت تھی یا نہیں تھی آپ کا نہیں ہمارا کام ہے اور آپ تو جوان ہیں، خوب صورت اور کچھ دار ہیں، زندگی کی بہت ضرورت ہے آپ کو۔“

”مفلوج زندگی کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔“
”ایسا نہیں کہتے، اللہ اپنے محبوب بندوں کو آزمائش کے لیے چتا ہے، ان کا ایمان اور حوصلہ آزماتا ہے جو اس کی آزمائش میں سرخرو ہو جاتے ہیں ان کے لیے بڑا انعام ہے اور جو اس آزمائش میں ہمت ہار دیتے ہیں وہ انہیں دنیا اور اس کی آسائشیں عطا کر دیتا ہے، ہو سکتا ہے آپ کو اللہ نے اس آزمائش کے ذریعے کچھ ایسا دینا ہو جس کا آپ تصور بھی نہ کر سکے۔“

”مجھے ضرورت نہیں ہے کسی چیز کی، آپ جائیں پلیز فی الحال میں کسی سے بھی بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ اس کا موڈ اس وقت بے حد خراب تھا۔ ڈاکٹر فرحت اپنا چشمہ ٹھیک کر کے رہ گئے۔

”آپ غلط کر رہے ہیں مسٹر زارون، مایوسی کفر پہلے سے زیادہ مضبوط کرنا تھا۔“

”آپ کا تو کوئی نقصان نہیں کر رہا ناں میں، پلیز جائیں یہاں سے۔“ اس بار وہ تلخ ہوا تھا۔ ڈاکٹر فرحت کو بے حد سبکی محسوس ہوئی مگر وہ ضبط کر گئے۔

”ٹھیک ہے، آپ کو بتانا تھا کہ آپ کی رپورٹس میں نے لندن میں اپنے ایک دوست کو بھجوائی ہیں، وہ آپ کا کیس دیکھ رہا ہے، جیسے ہی کوئی اچھی خبر آتی میں آپ کو بتاؤں گا، تیار رکھئے گا خود کو۔“ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ کمرے سے نکل گئے تھے۔

زارون ان کے جانے کے بعد کتنی بھی دیر تک گومکوسی کیفیت میں لیٹا رہا۔ رات ساری ایک عجیب سے اضطراب اور بے چینی کی نظر ہو گئی۔

صبح ڈاکٹر فرحت معائنے کے آئے تو اس نے خود انہیں مخاطب کیا۔
”آپ سے کچھ پوچھنا تھا ڈاکٹر۔“ وہ جو اس کی فائل پڑھ رہے تھے فوراً اس کے چہرے کی طرف متوجہ ہوئے۔

”جی پوچھیے۔“
”کیا میں ٹھیک ہو سکتا ہوں، زندگی میں دوبارہ کبھی اپنے پاؤں پر چل سکتا ہوں؟“
”بالکل، کل بتایا تو تھا آپ کو کہ آپ کی رپورٹس لندن بھجوائی ہیں، آپ کی وائف کو بھی یہ بات بتادی تھی کہ کچھ وقت لگے گا مگر آپ ان شاء اللہ دوبارہ اپنے پاؤں پر چل سکیں گے۔“

”واقعی؟“ اسے جیسے اپنے کانوں پر یقین بھی نہ آیا۔
ڈاکٹر فرحت نے اپنا سر اثبات میں ہلا کر گویا اسے زندگی دان کر دی۔ اب اسے سمجھا رہا تھا کہ غزالہ نے اس سے جھوٹ کیوں بولا تھا۔ حقیقت میں وہ اس سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ اسے بے ساختہ ہنسی آئی اور وہ ہنستا چلا گیا۔

اب اسے دنیا اور اس کی حقیقت کو پرکھنا تھا۔ خود کو پہلے سے زیادہ مضبوط کرنا تھا۔

محراب کو مجبوراً اس پر بھروسہ کرنا پڑا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہسپتال پہنچی تو زارون سو رہا تھا۔ آڑہ ڈاکٹر فرحت سے ملی اور ان سے زارون کے متعلق ساری معلومات لے کر وہ کوریڈور میں محراب کے پاس آ بیٹھی۔

”نانگ میں گولیاں لگی ہیں تمہارے شوہر کو، موصوف اپنی بیوی کے ساتھ کسی ہال میں تھے جب کسی لڑکے نے ان کی دوسری بیوی کو چھیڑ دیا اور یہ ہیر و بن کر اس سے الجھ پڑے۔ وہ کئی لڑکے تھے پھر اسلحہ بھی تھا ان کے پاس، لڑائی لڑائی میں زخمی کر کے چلے گئے۔“ مختصر لفظوں میں اس نے ساری روداد اسے کہہ سنائی۔ محراب مضطرب سی سر جھکا کر بیٹھی رہی۔

”کیا یہ سب ڈاکٹر نے بتایا ہے تمہیں؟“
”ہوں، تمہارے شوہر کی دوسری بیوی نے ڈاکٹر فرحت کو بتایا ہے یہ سب اور تمہیں پتا ہے ڈاکٹر فرحت کون ہیں، میرے فیاسی۔“ وہ اسے بڑے عام سے انداز میں بتا رہی تھی۔ محراب نے بے حد حیرانی سے سر اٹھایا۔
”واقعی؟“

”ہوں۔“ اس کے حیران ہونے پر وہ مسکرائی۔
محراب نے دوبارہ سر جھکا لیا۔

”کیا کہتے ہیں وہ زارون کی حالت کے بارے میں؟“

”فی الحال تو کچھ بھی کہنا مشکل ہے۔ چار گولیاں لگی ہیں دونوں ناگوں میں اسے ساری عمر کے لیے معذور بھی ہو سکتا ہے مگر یہ بات اس سے چھپا کر رکھنا اور ری ایکٹ کر سکتا ہے وہ، باقی اس کے گھر سے اطلاع کے باوجود اب تک کوئی نہیں آیا۔“

”کیوں؟“ ایک مرتبہ پھر اسے بے حد حیرانی ہوئی۔
آڑہ نے کندھے اچکا دیئے۔

”پتہ نہیں، یہ تو تم بھی معلوم کر سکتی ہو۔“

”ہوں، حویلی جا کر بھی ساری بات کا پتہ چل سکتا ہے۔ کیا تم ابھی مجھے حویلی ڈراپ کر سکتی ہو؟“

”بالکل چلو، تمہارا شوہر تو ویسے بھی ابھی دواؤں کے

محراب بے کل سی ٹیرس پر ٹہل رہی تھی جب اپنے گھر کی ٹیرس پر موجود آڑہ نے اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ محراب کے چہرے پر اس کی پریشانی صاف دیکھی جاسکتی تھی۔

زارون کل صبح کا گھر سے نکلا چوبیس گھنٹوں بعد بھی گھر واپس نہیں آیا تھا اور اب غزالہ نے اپنے ایک ملازم کے ہاتھ اسے پیغام بھجوادیا تھا کہ اسے گولیاں لگی ہیں وہ ہوسپتال میں ہے لیکن معذور ہو چکا ہے۔ ملازم اطلاع دے کر چلا گیا تھا مگر وہ تب سے بے حد پریشان تھی۔

آڑہ کو معلوم ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی مسئلہ ہے تب ہی وہ سیرھیاں پھلاتی اگلے پارچ منٹ کے بعد اس کے پاس موجود تھی۔

”السلام علیکم! کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔“

”لگ تو نہیں رہیں۔“

”ہوں، کچھ پریشانی ہے۔“

”کیا؟“

”میرے شوہر کل رات سے گھر نہیں آئے، اب ان کی دوسری وائف کے ملازم سے پتہ چلا ہے کہ وہ ہوسپتال میں ہیں گولیاں لگی ہیں انہیں۔“

”اوہ میرے اللہ پھر تو تمہیں ان کے پاس ہونا چاہیے تھا اس وقت۔“

”کیسے جاؤں؟ سوائے میرے شوہر کے میرا یہاں کسی کو نہیں پتا، نہ کوئی رابطہ ہے کسی سے۔“

”اچھا چلو میں لے جلتی ہوں، ہوسپتال کا پتہ ہے؟“

”ہوں، ایڈریس دے کر گیا ہے ملازم، ساتھ ہی یہ پیغام بھی دے گیا کہ میں رکشہ لے کر چلی جاؤں مگر مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔“

”کچھ نہ کرو، تم میرے ساتھ چلو، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔“ آڑہ نے اس کے ساتھ تکلف کی دیوار

گرادی تھی۔

زیر اثر شام سے پہلے تک نہیں اٹھے گا۔

”ٹھیک ہے پھر چلو۔“ اپنی شال سنبھالتی وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ آئرنہ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔
”غرض کروا کر تمہارا شوہرا اپنے پیروں پر نہ چل سکا تو تم کیا کرو گی، کیا حویلی واپس چلی جاؤ گی؟“ ڈرائیونگ کے دوران اس نے پوچھا۔

محراب اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیاں مسل کر رہ گئی۔
”نہیں، حویلی میں اب میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔“

”تو پھر کہاں رہو گی، گزر بسر کیسے کرو گی؟“
”پتہ نہیں، میں نے ابھی اس بارے میں کچھ نہیں سوچا۔“

”چلو کوئی بات نہیں پہلے حویلی سے ہو آؤ پھر اس موضوع پر دوبارہ بات کریں گے۔“ گاڑی حویلی کے راستے پر ڈالتے ہوئے آئرنہ نے بات ختم کر دی تھی۔
محراب تمام راستے کھڑکی سے باہر دیکھتی خاموش بیٹھی رہی۔ اس کا دل عجیب و سوسوں کا شکار ہو رہا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جانے کیا کرے۔

☆.....☆.....☆

گاڑی ایک جھلکے کے ساتھ حویلی کے بڑے سے کشادہ سرخ گیٹ کے سامنے رکی تھی، محراب اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔
”آؤ تم بھی آ جاؤ۔“

”نہیں، میں یہیں گاڑی میں انتظار کروں گی۔“
”مجھے دیر ہو جائے گی۔ اتنی دیر یہاں باہر گاڑی میں بیٹھنا ٹھیک نہیں، امی سے بھی لینا آ جاؤ پلیز۔“
”چلو ٹھیک ہے پھر۔“ اس کے اصرار پر اس نے انجن بند کر کے گاڑی لاک کر دی۔

وہ دونوں اندر آئیں تو عجیب سی وحشت ناک خاموشی نے ان کا استقبال کیا۔ شیشے کی مانند صاف شفاف سرخ حویلی میں سوائے پرندوں کی چہا کار کے اور کچھ سنا لی نہیں دے رہا تھا۔ محراب قدرے پریشان سی تیز قدم اٹھاتی

اپنے پورشن میں آ گئی۔

مریم بیگم اپنے بستر میں دہکی تیز بخار میں جل رہی تھیں۔ وہ بے قرار ہو گئی۔

”امی.....“ اس کی پچکار پر انہوں نے فوراً پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔

”محراب، میرے بچے، تم کب آئیں؟“ بازو اس کی کمر کے گرد حائل کرتے وہ فوراً اٹھ بیٹھیں۔

تب ہی آئرنہ نے بھی آگے آ کر ان کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔

”السلام علیکم آئی، میں آئرنہ ہوں، محراب کی دوست اور پڑوس۔“ اپنے تعارف کا مرحلہ اس نے خود بھی پنہا دیا تھا۔

محراب کی پیشانی کا بوسہ لیتی مریم بیگم اس کی جانب متوجہ ہوئی مسکرا دیں۔

”جیتی رہو بیٹی۔“ اس کی پیشانی پر بھی انہوں نے بوسہ دیا۔ آئرنہ کو بے حد اچھا لگا۔

”بخار کب سے ہو گیا آپ کو؟“ محراب نے پوچھا۔
تب وہ بولیں۔

”بخار تو اکثر رہتا ہے بیٹے، پرسوں کپڑے کافی جمع ہو گئے تھے بس جب سے وہ دھوئے ہیں ٹکڑا بخار جان نہیں چھوڑ رہا۔“

”آپ نے کیوں دھوئے کپڑے ملازم کہاں گئے سارے؟“ وہ حیران بھی ہوئی اور غصے بھی۔ مریم بیگم نظر چرا گئیں۔

”بس بیٹے ملازموں کو اور بھی سوکام ہوتے ہیں۔“
”بخار کی دوا لی؟“

”ہاں منگوائی تھی، اتر جاتا ہے پھر ہو جاتا ہے۔“
”کچھ کھایا بھی ہے آپ نے کہ نہیں؟“

”کھایا ہے کچھ دے بنا کر دے گئی تھی زینب، تم کہو کیسے نا ہوا..... زارون کہا ہے اب؟“

”آپ کو پتا ہے زارون کا؟“ وہ حیران ہوئی۔ مریم بیگم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”جی چچا جان۔“ اپنے سوال کا جواب اسے سردار عبداللطیف کی زبان سے مل گیا تھا۔

”شباباش، چلو جاؤ اب۔“ نہایت سفاکی سے بنا اس کے جذبات کا احساس کیے اسے اپنا فیصلہ سنا کر وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئے تھے۔

محراب بے حد بوجھل دلی سے ساتھ وہاں سے اٹھ آئی۔ وہ اچھی طرح جان گئی تھی کہ سردار عبداللطیف نے زارون سے اپنے بیٹے کا بدلہ لیا ہے اور اب وہ اس کی شادی ختم کر کے دوبارہ سے اس کا نکاح اپنے بیٹے سے کروانا چاہتے تھے تاکہ ان کے بیٹے کی ہر خواہش پوری ہو سکے۔

”کیا ہوا..... کیا کہہ رہے تھے سردار صاحب؟“ آرزو نے اس کا لٹکا ہوا چہرہ دیکھ کر پوچھا۔ وہ آہستہ سے نفی میں سر ہلا گئی۔

”لیکن تمہارا چہرہ تو کوئی اور کہانی سنارہا ہے۔“ وہ اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ محراب مریم بیگم کے پہلو میں ٹک گئی۔

”ہمارا اس حویلی سے دانا پانی ختم ہو گیا ہے امی، اب آپ بھی وہیں رہیں گی جہاں میں رہوں گی۔“ آرزو کو اس کے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ مریم بیگم کی آنکھیں بھر آئیں۔

”میں اس حویلی کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں محراب، میری نایاب یہاں ہے، تمہارے بابا کا وجود بھی اسی حویلی کی مٹی میں دفن ہے۔“

”جانتی ہوں امی لیکن کیا آپ مردہ رشتوں کے لیے اپنی زندہ جاوید بیٹی کے بغیر رہ سکیں گی..... نہیں ناں؟ اس لیے کہہ رہی ہوں اب آپ میرے ساتھ رہیں گی بس۔“ مریم بیگم کے سارے جوازاں نے رد کر دیئے تھے۔

آرزو نے بھی اشات میں سر ہلا کر اس کے فیصلے کی تائید کی۔ ابھی مریم بیگم کچھ بول بھی نہ پائی تھیں کہ مسز رجم وہاں چلی آئیں اور آتے ہی محراب پر چڑھ دوڑیں۔

”ہاں، عبداللطیف بھائی نے بتایا تھا یہاں حویلی میں سب کو۔“

”تو پھر کوئی ہسپتال کیوں نہیں گیا اس کے پاس؟“ اس نے پوچھا جب ایک ملازم وہاں چلا آیا۔

”محراب بی بی، آپ کو سردار صاحب بلا رہے ہیں۔“ اس کا دل دھڑکا۔

کن نظروں سے مریم بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اٹھی۔

”میں ابھی آتی ہوں امی، آرزو آپ بھی امی کے پاس بیٹھیں، میں چچا جان کی بات سن کر آتی ہوں۔“ ملازم کی تقلید میں ست قدموں سے چلتی وہ سردار عبداللطیف کے پورشن میں چلی آئی۔

سردار عبداللطیف اس وقت اپنے کمرے میں صوفے پر براجمان سیب چھیل رہے تھے، وہ سلام کرتی پاس بیٹھ گئی۔

”آپ نے مجھے بلایا چچا جان۔“

”ہاں..... زارون کے بارے میں بات کرنی تھی تم سے۔“

”جی چچا جان۔“

”دیکھو محراب، میرے مرحوم بھائی کی بیٹی ہوتم، جان سے پیاری ہو مگر ایک بات اچھی طرح جان لو، لال حویلی میں زارون عبدالرحیم کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، اس کا جو کردار ہے، میں اپنی بیٹی کو بھی اس کے یہاں ہونے سے محفوظ نہیں سمجھتا، نایاب اور تم پہلے ہی اس کے شیطانی دماغ کی بھیٹ چڑھ چکی ہو، اب بھی سارے زمانے میں ہمارے چہروں پر کالک ملنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اس نے تو جب تک تم اس شخص کے نکاح میں ہو، اس حویلی میں تمہارے لیے بھی کوئی جگہ نہیں، اس سے کہو فارغ کرے تمہیں تاکہ میں تمہارے سر پرست کے حیثیت سے کسی اچھے انسان کے ساتھ دوبارہ شادی کروا سکوں تمہاری، میری بات سمجھ میں آرہی ہے ناں تمہارے؟“

”کالے منہ والی منحوس ڈائن، میرے بیٹے کو ڈس لیا

تم نے، اس حویلی میں جو کچھ بھی برا ہو رہا ہے اس کی ذمہ دار صرف تم ہو، تمہاری وجہ سے اس حویلی کے دو مستقبل کے سردار معدوری کی زندگی گزاریں گے، خبردار اگر کبھی دوبارہ یہاں بھول کر بھی غلطی سے پیر رکھا، کچا چبا جاؤں گی میں تمہیں۔“ ان سے کچھ بعید نہیں تھا وہ واقعی اسے کچا چبا جاتیں اگر مریم بیگم بیٹی کی ڈھال نہ بن جاتیں تو۔

”بس کریں بھابی، آپ کے بیٹے کی وجہ سے میری پاک باز بیٹی بھری جوانی میں دردناک موت کی بھیٹ چڑھ گئی، آپ کے بیٹے کی وجہ سے میری محراب پر بدکاری کا الزام لگا اور اسے طلاق ہوئی، اب بھی آپ کو صرف اپنا درد دیکھائی دے رہا ہے، میرا درد کوئی درد نہیں، میری بیٹی کا درد کوئی درد نہیں۔“ زخمی شیرنی کی مانند دھاڑتے ہوئے انہوں نے محراب کو اپنے سینے میں دبوچ لیا تھا۔ تب ہی مسز رحیم بولیں۔

”بس..... بس زیادہ چیخیں مارنے کی ضرورت نہیں، اسے کہہ دیں دفع ہو جائے یہاں سے، میں اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“

”چلی جائے گی مگر مت بھولیں کہ یہ حویلی اس کے باپ کی بھی ہے، جتنا آپ کا حق ہے اس حویلی پر اتنا ہی میرا اور میری بیٹی کا بھی حق ہے۔“ ساری زندگی مصلحت کی چادر اوڑھے چپ رہنے والی وہ عورت اپنی اولاد کے لیے چپ نہیں رہ سکی تھی۔

محراب خشک پتے کی طرح کانپتی مریم بیگم کی پشت سے چمٹی رہی۔

مسز رحیم بک بک کرتی وہاں سے چلی گئیں تب مریم بیگم نے فیصلہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔

”تم صحیح کہتی ہو بیٹے اس حویلی سے واقعی ہمارا دانا پانی ختم ہو گیا ہے۔“ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ انہیں اپنی باقی کی زندگی مردہ رشتوں کے ساتھ گزارنی ہے یا زندہ رشتے کے ساتھ اور فیصلہ زندہ رشتے کے حق میں ہو گیا

تھا۔ اگلے ایک گھنٹے کے بعد وہ اپنا ضروری سامان سیٹ کر آ رہ اور محراب کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی تھیں۔

”کہاں چلنا ہے؟“ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے آ رہ نے پوچھا تب وہ بولی۔

”گھر چلو، زارون نے ایک سال کا ایڈوانس دیا ہوا ہے، ایک سال پورا ہو جائے گا تو سوچوں گی مجھے کہاں جانا ہے۔“

”تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے، تمہاری شوہر خیریت سے گھر آ جائے اس کے بعد میں تمہاری

جواب کا بندوبست کر دوں گی۔“

”کیسی جواب؟ میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں۔“

”کوئی بات نہیں، میرے پاپا کے بہت عزیز دوست

ہیں، انہیں ایک بہت اچھی کھانا پکانے والی شیف کی

ضرورت ہے، جو بخشتی اور ایمان دار ہو، وائف نہیں ہے ان

کی، بس صرف ایک بیٹا ہے جو اب تک باہر رہا ہے مگر اب

شاید پاکستان آ جائے کیونکہ انکل اب بیمار رہنے لگے

ہیں، روز آفس نہیں جاسکتے تو شاید ان کا بیٹا ان کی جگہ

آفس سنبھالے وہ تھوڑا خریلا اور کھڑوس ہے اسی لیے

انکل چاہتے ہیں کوئی اچھی صاف ستھری بخشتی شیف انہیں

مل جائے تاکہ ان کا بیٹا کھانے کے لیے کوئی ڈرامہ نہ لگا

سکے۔ خواتین کی عزت کرتا ہے وہ، میل شیف کو نکلنے نہیں

دیتا۔ آ رہ نے اسے ساری تفصیل سمجھائی۔

محراب اپنے آنسو پیتی فی الحال اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ آ رہ نے گاڑے اشارت کر لی تھی۔

زندگی ایک اور نئے سفر کی طرف رواں دواں ہو گئی تھی۔

(جاری ہے)

www.naeyufaq.com

وہ شہر کی آواز

نازیہ نازنی

digest novels lovers group

خود اپنی آگ میں جلتا کہاں سے
پرائی آگ میں جلتا رہا میں
میری تو جیت بھی ہار ہی تھی
خود اپنے آپ سے لڑتا رہا میں

”گرین ہلس“ کے سامنے کر گاڑی ایک جھکے
رکی۔

محراب نے اپنی طرف کا دروازہ کھولنے کے لیے بھی
ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ آڑھ نے پوچھا۔

”ہوسپٹل کب تک چلنا ہے؟“

”تھوڑی دیر ریست کر کے نکلتی ہوں۔“

”اوکے جب بھی جانا ہو مجھے کال کر لینا میں آ جاؤں
گی، میرا نمبر نوٹ کر لو۔“

”میں میں خود چلی جاؤں گی، بہت شکریہ آپ کا
آپ نے اتنا ساتھ دیا۔“

”کوئی بات نہیں مجھے اچھا لگتا ہے ہمیشہ مشکل میں
دوسروں کا ساتھ دینا۔ تمہارے لیے تو اب دوستی والی فیلنگو

آ رہی ہیں مجھے، چلو نمبر سیو کرو شاہاش۔“

”میرے پاس موبائل نہیں ہے۔“

”بھٹا..... نہ کرو یار۔“ محراب کے دھیمے لہجے پر وہ
بے ساختگی میں چلائی۔

”سچ کہہ رہی ہوں، ہمارے ہاں لڑکیوں کے پاس
موبائل کا تصور بھی نہیں ہے۔“

”کیوں.....؟ اب تو بہت فاسٹ دور جا رہا ہے

کیوں رات کی ریت پہ بکھرے ہوئے
تاروں کے کنکر چٹنی ہو

کیوں سناٹے کی سلوٹ میں
لپٹی آوازیں سختی ہو

کیوں اپنی پیاسی پلوں کی جھل میں خواب پروتی ہو
اب کون تمہاری آنکھوں میں

صدیوں کی نینداں ڈیلے گا
اب کون تمہاری چاہت کی

ہریالی میں کھیلے گا
اب کون تمہاری تنہائی کا ان دیکھا دکھ جھیلے گا

اب ایسا ہے
بغات مسلط سے جب تک

یہ قسمیں جب تک جلتی ہیں
یہ زخم جہاں تک چبھتے ہیں

یہ سائیں جب تک چلتی ہیں
تم اپنی شوخ کے جنگل میں

راہ بھٹو اور پھر کو جاؤ
”اب سو جاؤ“

.....☆☆☆.....

”کیا ہوا، اداس ہیں؟“ انہیں تنہا سوچوں میں گم بیٹھی

دیکھ کر وہ بولی۔ مریم بیگم نے آہستہ سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہلکے سے اس کا گال چھوا۔

”نہیں بیٹا۔“

”جھوٹ مت بولیں۔ میں سب جانتی ہوں، آپ کے لیے جو اور بیاب کو چھپے چھوڑ کر آنا آسان نہیں تھا۔“

”ہاں..... مگر تمہیں چھوڑ دینا بھی آسان نہیں تھا۔“

”ہم ایک دوسرے کے ساتھ یہاں خوش رہیں گے امی۔“

”ہوں.....“ مہراب کے ہاتھ تھامنے پر وہ محض سر ہلا گئیں۔

”چلیں اب آپ کچھ دیر آرام کر لیں..... میں آ کرہ سے کہہ دیتی ہوں میری غیر موجودگی میں وہ آپ کے پاس آ جائے گی۔“

”تم کہیں جا رہی ہو کیا؟“

”یار۔“

”جتنا بھی فاسٹ دور چلا جائے ہمارے گھرانوں کی روایات پر اثر نہ کر سکتا۔“

”چلو ٹھیک ہے کوئی بات نہیں اس کا حل بھی جلد ہی نکال لیں گے لب فی الحال اتنی کوئے کر چلو، شاید انہیں آرام کی ضرورت ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مہراب اثبات میں سر ہلاتی گاڑی سے اتر گئی۔

مریم بیگم اب تک خاموش تماشاخی بنی گاڑی میں یوں بیٹھی تھیں جیسے ان کا وجود ہی نہ ہو۔ مہراب نے ان کی جانب کا دروازہ کھولا۔ انہیں گاڑی سے اترنے میں مدد دی۔

”چلیں امی.....“ بڑا رات سے اس دیوید کل بنگلے میں داخل ہونے سے خوف نہیں ہاتا۔

مریم بیگم اس کی ہدایت پر پاپا پاپا آگے بڑھ گئیں۔ اگلے پندرہ منٹ کے بعد وہ ان کے لیے چائے بنا کر لے آئی تھی۔



”مجھے ہوسپتال جانا ہے امی۔“

”اس وقت ہوسپتال کیوں جا رہی ہو؟“

”زارون کے لیے..... اسے اس وقت میری ضرورت ہے۔“

”نہیں..... کوئی ضرورت نہیں ہے اسے تمہاری.....“

وہ تائب کا قاتل ہے، تمہاری خوشیوں کا قاتل ہے، جو بھی اس کے ساتھ ہوا ہے اس کی اپنی غلط حرکتوں کی سزا ہے۔ تمہیں اب اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔“ مریم بیگم اس وقت اس کا زارون کے پاس ہوسپتال جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔

”نہیں امی! یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے..... بہت بری حالت ہے زارون کی، اس حال میں اگر میں بھی اس جیسی بے حس بن جاؤں تو میرے اور اس کے درمیان کیا فرق رہ جائے گا؟“ محراب نے امی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

”میں کچھ نہیں جانتی..... وہ لڑکا اب تمہارے قاتل نہیں ہے۔“

”پہلے بھی نہیں تھا مگر میں اس کے ساتھ رہ رہی تھی اب تو حاکم بھی نہیں رہا اور پھر سب سے بڑی بات جس مذہب کی میں پیروکار ہوں ناں امی..... اس مذہب میں انسانیت اور خصوصی طور پر شوہر کے مقام کا درس بہت واضح دیا گیا ہے۔ اللہ کے بعد اگر کسی کو سجدے کا حکم ہوتا تو بیویاں اپنے شوہروں کو سجدہ کرتیں، میں اسے سجدہ نہیں کر رہی صرف اس کی مدد کر رہی ہوں۔ کیا آپ نے یہ سب نہیں سکھایا ہمیں؟“ محراب امی کو قائل کرنا چاہا۔

مریم بیگم اس بار خاموش رہیں۔ ان کی بیٹی اپنا فرض نبھا رہی تھی جس سے وہ اسے باز نہیں رکھ سکتی تھیں۔

بلا آخر وہ امی کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئی اور ان کی اجازت سے انہیں سلی دے کر نکلی تو شام کے چار بج رہے تھے۔ کھانگی پر بندھی ریٹ وائچ پر وقت دیکھتے ہوئے اس نے پاس سے گزرتا رکشہ روکا اور ہوسپتال کے لیے روانہ ہو گئی۔

جس وقت وہ ہوسپتال پہنچی آسمان کالے سیاہ بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ رکشے والے تو مطلوبہ کرایہ دے کر وہ قدرے تیز قدموں سے چلتی جوں ہی زارون کے کمرے کے باہر پہنچی اندر سے آتی زارون کے بڑے بھائی کی تیز آواز نے اس کے قدم وہیں جکڑ لیے تھے۔

”خاک ڈال دی ہے تم نے ہمارے سروں میں..... کس منہ سے آتے یہاں تمہارا حال پوچھنے، سارے علاقے کے سردار ناراض ہوئے بیٹھے ہیں تمہاری حرکتوں پر ان سب نے تم سے قطع تعلق کی وارننگ دے دی ہے۔ اسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے تم سے کہا تھا کہ دفع ہو جاؤ یہاں سے کہیں چلے جاؤ اور جب تک یہاں ہوا احتیاط سے کام لو مگر نہیں تمہیں تو عادت ہے ناں رنگ برنگی تیلیوں کے ساتھ ادھر ادھر جھک مارنے کی..... اب دیکھ لیا ناں اس لاپرواہی کا نتیجہ، پڑے رہنا ساری زندگی اس بستر پر لاوارثوں کی طرح، کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تمہارے زخموں پر پھائے رکھے۔“ اس لمحے محراب کے دل کی ڈھکن تیز ہوتی تھی۔

”بس یہی سب کہنے آئے تھے یہاں؟“ زارون عبدالرحیم نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”نہیں جوتے مارنے آیا تھا تمہیں مگر فی الحال تمہاری حالت ایسی نہیں ہے اس لیے زبانی کھامی ڈانٹ سے کام لے رہا ہوں۔ وہ الونگی جیجی جو جیجی ہے ابھی کے ابھی فارغ کرو اسے پھر تمہارے بارے میں سوچتے ہیں کیا کرنا ہے۔“

”آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں بھائی..... وہ لڑکی اب خود ہی مجھ سے جان چھڑا رہی ہے۔“

”چلو یہ تو بہت اچھی بات ہے تم بھی اس سے اپنی جان چھڑالو۔“ لیکن اس بار زارون بھائی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

باہر دروازے کے قریب کھڑی محراب خون کے گھونٹ لی کر رہ گئی تھی۔

”چلو تھیک ہے اب چلتا ہوں میں کسی چیز کی ضرورت

ہو تو بتا دینا۔“ تب ہی محراب کے وجود میں قدم آگے بڑھانے کی جرأت پیدا ہوئی تھی۔

”السلام علیکم!“ اس کے سلام پر زارون اور لالہ دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”علیکم السلام! کیسی ہو؟“ اس کے سر پر بھاری ہاتھ رکھتے ہوئے لالہ نے اس کی خیریت دریافت کی۔ محراب سر جھکائے کھڑی رہی۔

”میں ٹھیک ہوں لالہ آپ کیسے ہیں؟“

”کرم ہے اللہ پاک کا..... ایسا ہے کہ مجھے ابھی ضروری کام ہے۔ میں چلتا ہوں تم زارون کا خیال رکھو، ابھی یہ جس حال میں ہے اسے تمہاری ضرورت ہے۔ جو بھی اس نے تمہارے ساتھ کیا اسے بھول جاؤ بس اتنا یاد رکھو کہ یہ تمہارا شوہر ہے، تمہیں اس کا خیال رکھنا ہے، اس کا ساتھ دینا ہے۔ میں تم سے رابطے میں رہوں گا اور ہاں تمہیں اس وقت بالکل بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”جی لالہ.....“ لالہ کی لمبی چوڑے ہدایت کے جواب میں وہ محض یہی کہہ سکتی تھی جواب میں وہ اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے باہر نکل گئے تھے۔

محراب نے دیکھا زارون کا چہرہ کافی پیلا اور بے رونق سا ہو رہا تھا آنکھوں کی چمک بھی ماند پڑ گئی تھی شاید اس کا بہت زیادہ خون بہا تھا۔

”اب کیسی طبیعت ہے؟“ بستر پر اس کے پاؤں کی طرف بیٹھتے ہوئے اس نے زارون سے نظر ملائی مگر وہ نظر چرا گیا۔

”ٹھیک ہوں، بڑی جلدی آگئیں تم۔“ اس کے یوں طنز یہ انداز میں شکوہ کرنے پر وہ مسکرا دی۔

”صبح آئی تھی مگر تم دو آؤں کے زیر اثر سو رہے تھے۔“

”کس کے ساتھ آئی ہو؟“ سوال ایسا تھا کہ چند لمحوں تک وہ کچھ نہ بولی سکی۔

”غزالہ آئی تھی؟ مگر.....“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔ محراب کا سر نفی میں ہل گیا۔

”نہیں ملازم کو بھیجا تھا اس نے اسی سے پتا چلا۔“

”تمہیں تو خوشی ہو رہی ہوگی تمہاری بد دعا میں رنگ لائیں۔“ جاننے وہ اس کے اندر سے کیا کھوجنا چاہ رہا تھا۔ محراب کی نظر پھر اس کی نظروں سے الجھ گئی۔

”تمہاری طرح خود غرض اور دوسروں کا برا چاہنے والی نہیں ہوں میں۔“

”نہیں..... پھر کیا میری ہمدردی میں یہاں آئی ہو؟“

”نہیں میری نظر میں تم کسی ہمدردی کے لائق نہیں ہو۔“

”تمہاری نظر میں تو میں محبت کے لائق بھی نہیں ہوں۔“

”جی ہاں۔“

”پھر کس لائق ہوں میں؟“

”اللہ بہتر جانتا ہے، جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔“

”اوہ..... یعنی میں نے جو عباد کے ساتھ کیا اسی کی سزا ہے۔“

”جی ہاں۔“

”پھر اب کیا کروں جا کر معافی مانگوں اس سے؟“

”مانگنی تو چاہیے۔“

”شٹ اپ۔“ اسے غصا آیا تو محراب رخ پھیر گئی۔

”کیا کہتے ہیں ڈاکٹر کب تک فارغ کریں گے تمہیں۔“

”کیوں تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ عباد کے ذکر پر اس کا لہجہ تنہا ہو گیا تھا۔ محراب: ”موٹی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔“

”کوئی وجہ نہیں ویسے بھی پوچھا۔“

”ابھی چار پانچ دن لگیں گے۔ تم چاہو تو یہیں رک سکتی ہو، اکیلی نہیں رہ سکتیں تم وہاں۔“

”اکیلی نہیں ہوں امی ساتھ ہیں میرے۔“

”وہ کب آئیں؟“

”آج صبح ہی لائی ہوں، لال حویلی میں اب ان کی اور میری کوئی جگہ نہیں رہی۔“

”کیوں؟“

سے۔“ اس نے بے زاری سے کہا۔ محراب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔
”لالہ کیا کہہ رہے تھے؟“
”کچھ نہیں۔“

”کیا تمہاری دشمنی تھی کسی کے ساتھ؟“
 ”ہاں..... محراب عبدالکریم کے ساتھ۔“
 محراب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے کچھ
 اس انداز سے کہا کی وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”تم ساری زندگی نہیں سدھر سکتے، کبھی بھی نہیں۔“
 ”سدھر کے کرنا بھی کیا ہے، تمہاری نظروں میں تو
 ہمیشہ برائی رہوں گا میں۔“

”تمہیں فرق پڑتا ہے اس بات سے کہ میری نظروں میں تمہاری کیا حیثیت ہے؟“

”نہیں۔“ بے حد حشائی سے اس نے کہا تو وہ کھس کر زدگی۔

”تو پھر میرے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔“
”تمہیں کس نے کہا میں تمہارے بارے میں سوچتا ہوں۔“

وہ لطف اندوز ہوتا ہے چڑا کر۔ محراب اسے کھور کر رہ گئی۔

”چلو کروٹ بدلاؤ مجھے، ایک ہی سائید پر لیٹے لیٹے
تھک گیا ہوں۔“ اس حکیمانہ انداز میں کہا۔

”نرس کو بلا کر لائی ہوں۔“ اس نے بے زاری سے کہا۔

”کیوں نہیں لیا مسئلہ ہے؟“
 ”کوئی مسئلہ نہیں، ابھی نیا نیا زخم ہے احتیاط بہتر“
 ”سنا ہے کہ کبھی کبھار زخم کا گھٹا“

تقریباً پانچ منٹ بعد نرس نے آکر اسے کروٹ بدلا

محراب ڈاکٹر سے مل کر گھرا گئی۔
 یہ ہمیں بتا رہا تھا کہ محراب نے ان کی منہ خراب

العزت سے دعا کرو کوئی مثبت جواب آئے۔ ان شاء اللہ تمہارا شوہر دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا۔“
”ان شاء اللہ“ بے ساختہ اس نے کہا تو آئزہ مسکرائی۔

”رات میں اسے تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔“
”ہاں..... مگر میں امی کو اکیلی چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“
”تم امی کی فکر مت کرو۔ میں ہوں ناں، میں ان کا خیال رکھ سکتی ہوں۔“

”تمہارے گھر والے اعتراض کریں گے۔“
”نہیں، کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ میں آنٹی کو اپنے گھر لے جاؤں گی۔ صبح جب تم واپس آؤ تو لے آنا ساتھ۔“ اس نے مسئلے کا حل نکالا۔ محراب اس کی اس درجہ محبت پر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

رات کا کھانا اس نے وقت سے پہلے ہی تیار کر لیا تھا۔ مریم بیگم سو کر اٹھیں تو اس نے کھانا لگا دیا۔ اسے بھوک نہیں تھی مگر پھر بھی صرف مریم بیگم کی خاطر اس نے ان کا ساتھ دیا۔ کھانے کے بعد برتن سمیٹ کر وہ مریم بیگم کو بتا کر ہسپتال کے لیے روانہ ہو گئی تھی۔

آئزہ نے اسے ڈرائیور کے ساتھ گاڑی کی آفر کی مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔

وہ جب ہسپتال پہنچی تو زارون جاگ رہا تھا۔ اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر اس نے خشکی سے رخ پھیر لیا۔

”السلام علیکم!“ محراب نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

”اب کیسی طبیعت ہے؟“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا لیکن زارون نے کوئی جواب نہیں دیا۔
”پتا نہیں۔“

”کیوں..... کیا ہوا، کوئی آیا تھا کیا؟“
”تم سے مطلب؟ کوئی آئے، کوئی جائے یا میں اکیلا

یہاں پڑا بے بسی سے سڑتا رہوں۔ تم کون ہوئی پوچھنے والی؟“ اس نے خشکی سے کہا۔ محراب کے لبوں پر بے

مصروف ہو گئی ابھی آنا گوندھ کر رکھا ہی تھا کہ آئزہ چلی آئی۔

”السلام علیکم!“ بلند آواز میں سلام کرتے ہوئے وہ کچن میں ہی آ گئی۔

محراب نے آنا ڈھانپتے ہوئے پیچھے پلٹ کر دیکھا پھر اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے آنا فریق کچن میں رکھ دیا۔

”کیسی ہو، ہسپتال نہیں جاتا؟“ آئزہ نے پوچھا لیکن وہ جواب دینے کے بجائے مسکرا دی۔

”ٹھیک ہوں اور ہسپتال سے ہو کر بھی آئی ہوں۔“
”واقعی.....؟“

”جی ہاں.....“
”کمال کر دیا، بتایا ہی نہیں۔“

”کیسے بتائی، موبائل نہیں ہے میرے پاس، بتایا تھا تمہیں..... اسی لیے رکشہ لے کر چلی گئی تھی۔“

”ہوں..... کیسی طبیعت ہے اب تمہارے شوہر کی؟“
”پہلے سے بہتر ہے۔“

”اس وقت کون ہے اس کے پاس؟“
”کوئی بھی نہیں۔“

”کیوں.....؟“ فریق سے سیب نکال کر صاف کرتے ہوئے وہ حیران ہوئی جب محراب نے بتایا۔

”گھر والے ناراض ہیں اس سے۔“
”اور اس کی دوسری بیوی؟“

”وہ بھی چھوڑ رہی ہے۔“
”تمہیں کسے پتا؟“

”اپنے بھائی کو بتا رہا تھا وہ۔“
”ظاہر کی بات ہے، اب وہ کیوں رہے گی اس کے

ساتھ، وہ اب اس کے کسی کام کا جو نہیں رہا۔“ سیب کا بڑا سا ٹکڑا دانتوں سے کاٹتے ہوئے اس نے کہا۔ محراب رخ پھیر گئی۔ تب ہی وہ بولی۔

”بحر حال پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ فرحت نے تمہارے شوہر کی رپوش باہر بچھوائی ہیں۔ اللہ رب

”کس لڑکی سے؟“

”وہی جس کی محبت میں اس حال کو پہنچے ہو۔“ جانے وہ اس کے اندر سے کیا کھوجنا چاہ رہی تھی۔ زارون کی نظریں اس کے شاداب چہرے پر جم گئیں۔

”ہاں بہت پیار کرتا ہوں۔“

”کیا فائدہ..... وہ تو چھوڑ گئی تمہیں۔ اب تم جلو کر رہو، بھوکے رہو اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”تمہیں فرق پڑتا ہے؟“ اس کے دیکھنے کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا۔

”ہاں مجھے تو پڑتا ہے، شدید نفرت کے باوجود اس حال میں، کیا نہیں چھوڑ سکتی تمہیں۔“

”کیوں؟“

”بس ضمیر اجازت نہیں دیتا۔“

”زل تو چاہتا ہوگا بدلہ لینے کے لیے۔“

”ہاں چاہتا ہے مگر بدلے کی آگ پر اللہ کا خوف غالب آ جاتا ہے۔“

وہ ذہن تھا مگر محراب ہمیشہ اپنے لفظوں سے اسے لا جواب کر دیتی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ چند لمحے پھر خاموشی کی نذر ہو گئے پھر وہ بولا۔

”تم چاہو تو میں اب تمہیں آزاد کر سکتا ہوں۔“

”کیوں؟“ محراب نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

زارون نے کوئی جواب دینے کے بجائے لمبی سرد آہ بھر کر رخ پھیر لیا۔

”تمہارے قابل جو نہیں رہا ہوں اب۔“

”قابل تو پہلے بھی نہیں تھے۔“

”پہلے کی بات اور تھی، اب تو تمہاری حفاظت بھی نہیں کر سکتا۔“

”ہوں صحیح کہا تم نے مگر میں اب آزاد ہو کر جاؤں گی کہاں؟ کوئی در، کوئی راستہ کھلا چھوڑا ہے تم نے میرے لیے..... میں تو سانس بھی نہیں لے سکتی کھل کر جینا تو بہت دور کی بات ہے۔“

ساختمے مسکراہٹ بکھر گئی۔

”سوتا چھوڑ کر گئی تھی تمہیں۔ امی اکیلی تھیں، ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ رات کا کھانا پکانا تھا۔ تمہارے لیے بھی لائی ہوں۔“ وہ اسے وضاحت دینے کی عادی نہیں تھی مگر وہ لمحہ ایسا تھا کہ نا چاہتے ہوئے بھی وہ اسے تکلیف میں نہ رکھ سکی۔ چند لمحوں کے لیے کمرے میں خاموشی چھائی رہی پھر وہ بولا۔

”تم کب جان چھڑا رہی ہو مجھ سے؟“ محراب کو اس سے اس قسم کے سوال کی توقع نہیں تھی تب ہی اس نے اسے قدرے چونک کر دیکھا۔

”تم جان چھوڑنے والوں میں سے نہیں؟“

وہ چپ رہا مگر وہ دیکھ سکتی تھی کہ اس وقت اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ اور اداس تھا۔ تب ہی اسے ایک نظر دیکھ کر اس نے سوپ والا باؤل اٹھالیا۔

”چلو اٹھ کر بیٹھو، تھوڑا سوپ پی لو، طبیعت بحال ہو جائے گی۔“

”میرا موڈ نہیں ہے۔“

”پیٹ بھرنے کے لیے موڈ کی نہیں بھوک کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”بھوک بھی نہیں ہے۔“

”کیوں؟“

”پتا نہیں۔“

”اس طرح تو تم کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتے۔“

”کس طرح۔“

”یوں خود کو بھوکا اور پریشان رکھ کر۔“

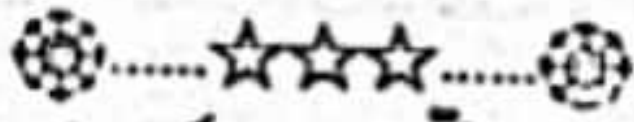
”تو کیا کروں جب خواہش نہیں ہے۔“

”تھوڑا سا سوپ پی لو، تمہیں اچھا لگے گا۔“ محراب نے ہاں اور ساتھ ہی ایک چمچ کر اسے منہ کے قریب کر دیا۔

زارون اس بار اسے منع نہیں کر سکا۔

”کیا بہت پیار کرتے ہو اس لڑکی سے؟“ سوپ پلانے کے دوران اس نے پوچھا تو وہ چونکا۔

محراب اسے گھورتی دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔



اس رات بہت ٹھنڈی تھی۔ محراب کی اچانک آنکھ کھل گئی۔

کمرے میں ٹائٹ بلب کی مدہم روشنی میں اس نے زارون کو دیکھا جو جانے کب سے بستر سے خود اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش میں بے حال ہو رہا تھا۔ وہ فوراً اٹھی۔

”کیا بات ہے، کہیں جانا ہے؟“ ڈو پٹے سے بے نیاز قدرے پریشانی سے اس نے پوچھا۔

”ہاں، باہر لان میں جانا چاہ رہا تھا، یہاں کمرے میں دم گھٹ رہا ہے۔“ زارون نے کہا۔

”اس وقت.....؟“ محراب کی نگاہیں کھاک کی جانب اٹھیں۔

”ہاں.....“

”چلو میں لے چلتی ہوں۔“ سر اپنے پڑاؤ پٹا اٹھا کا سر پر اوڑھتے ہوئے وہ اس کی ڈھیل چیر چلاتے ہوئے لان میں لے آئی۔ محراب نے اس کی کسرنی کمر کے گرد بازو ڈال کر اسے اٹھنے میں مدد دی۔ ساتھ والے کمرے میں مریم بیگم تہجد پڑھ کر سو رہی تھیں۔ دونوں کمروں کے درمیان ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جو کھلا رہتا تھا۔

زارون کو ڈھیل چیر چیر بٹھانے کے بعد وہ لان میں آئی تو تازہ ہوا کے سرد جھونکوں نے اسے بے ساختہ کپکپانے پر مجبور کر دیا تھا۔

”صبح ہو سہل جانا ہے چیک اپ کے لیے۔“

”ہوں.....“

”آرہ بتا رہی تھی تمہاری بیوی نے خلع کے لیے عدالت میں کیس کر دیا ہے۔“

”اسے کس نے بتایا؟“

”پتا نہیں شاید نیوز وغیرہ میں سنا ہوگا۔“

”ہوں۔“

”کیا اسی کی پریشانی ستا رہی ہے اس وقت۔“

”محراب؟“

”کچھ نہیں، بس اپنی پروا کرو، ایک معمولی سے حادثے کی وجہ سے تمہیں انسان بننے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ اس کے لفظوں میں کڑواہٹ تھی۔ زارون اسے دیکھتا رہ گیا۔

اگلے دو روز کے بعد اسے ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا تو محراب نے سکھ کی سانس لی۔

غزالہ نے عدالت میں خلع کے لیے کیس دائر کر دیا تھا۔ زارون کو خبر ہوئی تو وہ دیر تک ہستارہا۔

محراب اس کے کمرے کی صفائی کے لیے آئی تو اس نے اسے اپنے قریب بلائے ہوئے کہا۔

”بات سنو۔“ صفائی کرتے محراب کے ہاتھ رک گئے اور وہ اس کے قریب آ کر بولی۔

”ہوں کہو۔“

”اگر میں کبھی ٹھیک نہ ہو سکا تو تم کیا کرو گی؟“

”وہی کروں گی جو اب کر رہی ہوں۔“ اس نے دوبارہ جواب دیا۔ وہ مسکرا دیا۔

”سوچ لو، بہت مشکل سفر ہے۔“

”پہلے سے زیادہ مشکل نہیں ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”پہلے ہر وقت اعصاب پر سوار رہتے تھے اب چلو سکون سے ایک ہی کمرے میں تو نکلے رہتے ہو۔“ اس کا جواب ایسا تھا کہ وہ کھل کر ہنسے بغیر نہیں رہ سکا۔

”اچھا بات سنو۔“ وہ ابھی پٹی تھی کہ اس نے پھر پکارا۔

”اب کیا ہے؟“

”اچھی لگ رہی ہو، بلیک کلر کافی اٹھتا ہے تم پر۔“

”شکریہ.....“

”آج سر میں بہت درد ہے، دبا دو گی؟“

”اتنا بولتے ہو گلے میں درد نہیں ہوتا؟“

”نہیں..... لیکن تم اگر دوبانے کی خواہش رکھتی ہو تو تمہیں اجازت ہے۔“ وہ کب ہار مانے والا تھا۔

”پتا ہوتا بھی کیسے، میں تو شروع سے صرف تمہارے بارے میں سوچتا تھا، میری نظر میں اس تعلق کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی جو بڑوں نے میرے اور نایاب کے درمیان باندھ دیا تھا، اسی لیے یونیورسٹی میں جو لڑکی اچھی لگتی اسی کے پیچھے لگ جاتا تھا۔ آدھی سے زیادہ یونیورسٹی کی لڑکیاں خود میرے پیچھے تھیں۔ غزالہ کا شمار بھی ان ہی لڑکیوں میں تھا۔ نایاب روزیہ سب دیکھتی اور برداشت کرتی مگر مجھے پروا نہیں تھی، مجھے اس کی کسی بھی تکلیف کی پروا نہیں تھی۔“

”غزالہ کے ساتھ میرے غلط تعلقات کی ساری
یونیورسٹی گواہ تھی۔ اس کے باوجود اس روز جب نایاب نے
وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پھر حویلی میں سب کو
بتانے کی دھمکی دی میں اس کی یہ جرأت برداشت نہ
کر سکا۔ غرور و تکبر نے مت مار دی تھی۔ اسی لیے وہ جیسے
بھی چھٹی پر حویلی آئی میں نے یہ معاملہ غزالہ کے سامنے
رکھا اور غزالہ نے بھی مجھے یہ راہ دکھائی کہ ہمیشہ کی طرح
میں اپنا گناہ اس پر ڈال دوں۔ اس کام کے لیے اس نے
اپنے کزن کو راضی کیا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ حویلی میں
میرے بارے میں کسی کو کچھ بتاتی، میں نے اور غزالہ نے
اس کے کزن اور اپنے دوست صائم کو حویلی بلا لیا۔ نایاب
جاگ رہی تھی..... حویلی کی اونچی دیواروں اور خوں خوار
کتوں سے میں ہی اسے بجا کر نایاب کے کمرے تک لایا
تھا۔ میں نے ہی نایاب کے کمرے کی نشاندہی کی تھی،
سارا پلان میرا تھا اور ویسے ہی کامیاب رہا جیسے میں نے
سوچا تھا۔ حویلی کے بزرگوں کی آنکھوں پر غصے کے
طوفان نے پٹی باندھ دی تھی۔ اس وقت وہی دیکھا گیا جو
میرا نمبر دکھانا چاہتا تھا، وہی سنا گیا جو میں سنانا چاہتا تھا۔
راؤ رات اس کی موت کی فیصلے پر عمل درآمد ہوا اور اسے
اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا ایک موقع بھی نہیں ملا۔ میں

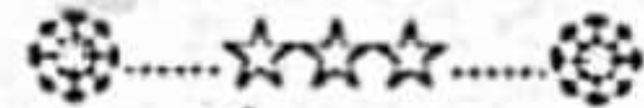
تھک گیا ہوں یہ سب سوچ سوچ کر۔ میں ذلت کے گڑھے میں گر گیا ہوں محراب..... مجھے اس کی بددعا لگ گئی۔“

وہ لب آزاد تھا جب اسے دنیا سے گئے بھی مبینوں ہو گئے تھے۔ محراب کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔

نایاب کے ساتھ ہوئے ظلم کی کہانی نے اس کے زخم جیسے پھر سے ہرے کر دیئے تھے۔ وہ انہی اور نفرت سے بھر پور ایک نگاہ اس کے مفلوج وجود پر ڈالتے ہوئے اندر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ زارون اس کی نفرت بھری نگاہ پر کرب سے لب بھینچنا شدت سے منھیاں بھینچ کر رہ گیا تھا۔

ایک درو پچھتاوے کی صورت دل کے اندر سر اٹھا رہا تھا تو ایک درو نے محبت کی تکلیف کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے باہر کے کھل وجود کا گھیراؤ کر لیا تھا اب وہ کہاں جاتا؟

سانس تنگ، دور ہی تھی، گھٹن بڑھتی جا رہی تھی مگر اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔



اگلے روز اس کا چیک اپ تھا مگر وہ اس کے ساتھ ہسپتال نہیں گئی بلکہ اسے آڑہ کے ساتھ ہسپتال بھجوا دیا۔ جس کے آپریشن اور علاج پر اچھا خاصا خرچ آیا تھا۔ تمام روپیہ محراب نے اس کے اے ٹی ایم سے ادا کیا، اب بھی وہ اس کے اے ٹی ایم سے ہی سارا خرچ کر رہی تھی، مگر کب تک؟

زارون کے بھائیوں اور دوستوں نے اس کی طرف سے مکمل آنکھیں پھیر لی تھیں۔ اتنے دنوں میں کوئی خیریت پوچھنے بھی نہیں آیا تھا، خرچہ اٹھانا تو بہت دور کی بات تھی۔ اسی پریشانی میں ابھی، وہ گھر پر بھی مختلف کاموں میں مصروف اس کی گھر واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ شام ڈھل چکی تھی جب وہ آڑہ کے ساتھ واپس آیا تھا۔ بجھا بجھا سا اداس، بے رونق چہرہ..... زندگی سے بے زار خوب صورت آنکھیں محراب نے اس کا تفصیلی جائزہ

لیا۔ ”کیا کہاؤا کڑنے؟“ زارون کو مکمل نظر انداز کر کے اس نے آڑہ سے پوچھا۔ جواب میں وہ اپنی ڈھیل چیر گھسٹاؤں سے چلا گیا۔

کچھ نہیں، پہلے سے بہتر ہیں تمہارے شوہر اور وہ جو رپورٹس باہر بھجوائی تھیں ناں ان کا بھی مثبت جواب آیا ہے۔“

”چلو اچھی بات ہے، دوبارہ کب چیک کروانا ہے؟“ ”اگلے ہفتے۔“ ”ٹھیک ہے۔“ ”تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟“ ”کس بات کی؟“

”تمہارے شوہر کی رپورٹس اچھی آئی ہیں یار..... اس کا باہر علاج ہو سکتا ہے اور وہ اپنے پاؤں پر پھر سے چل سکتا ہے۔“

”ہوں بات تو خوشی کی ہے مگر میرا دل خوش نہیں ہے وہ جینے یا مرے میری بلا ہے۔“

”ایسا کیوں؟“ آڑہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”وہ میری بہن کا قاتل ہے اس لیے۔“ محراب نے بتایا۔

”وہ بات.....!“ آڑہ کو جیسے شاک لگا۔ ”محراب نے مختصر لفظوں میں اس کے ظلم کی مکمل کہانی اس کے گوش گزار کر دی۔“ ”یہ تو بہت برا ہوا یار، ایسے کون کرتا ہے۔“ ”زارون عبدالرحیم۔“

”پھر بھی اس کے ساتھ رہ رہی ہو تم۔ سب سے پہلے تو تمہیں اس سے خلع لینی چاہیے۔“

”اس سے کیا ہوگا، وہ بھی رل جائے گا اور میں بھی۔“ ”اس کا مطلب ہے تم نے اسے معاف کر دیا۔“ ”نہیں معاف نہیں کیا، بس قسمت کے ساتھ سمجھوتہ کیا ہے۔“

”ایسے تو بہت مشکل ہو جائے گی یار..... زندگی ایسے

بسر نہیں ہوتی۔“

”زندگی بسر کرنے کی خواہش اب دہی بھی نہیں۔“

پھلکی سی مسکراہٹ لبوں پر پھیلاتے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے ٹپکوں پر آئی نمی صاف کی۔ آڑھ چند لمحوں تک کچھ نہ بول سکی۔ تب ہی اس نے پوچھا۔

”تم اس روز کسی جاب کا ذکر کر رہی تھیں۔“

”میرے انکل کی قیسی ہے، بہت اچھے انسان ہیں۔“

”نہیں کبھی نہیں، بس انکل ریٹائرڈ کرلے ہیں، ایک بیٹی تھی اس کی شادی ہو گئی۔“

”اس سے چھوٹا ایک بیٹا ہے اس نے کسی عیسائی عورت سے جرمنی میں شادی کر لی، کچھ عرصہ یہ میاں بیوی کا رشتہ قائم رہا پھر دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ اب وہ صاحب زادے پاکستان واپس آ رہے ہیں تو انکل چاہتے ہیں کہ اس کے آنے سے پہلے انہیں کوئی اچھی کک مل جائے تاکہ گھر کا نظام چل سکے۔“

”ہوں تنخواہ کتنی ہوگی؟“

”یہ تو نہیں پتا لیکن پچیس تیس سے اوپر ہی ہوگی۔“

”بیٹا کیسا ہے ان کا؟“

”بہت کھڑوس ہے، حسین سے حسین لڑکی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔“

”تو پھر تم بات کرو ناں اپنے انکل سے میرے لیے۔“

”کر لوں گی..... تم پہلے آئی سے بات کر لو، انہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔“

”نہیں وہ اعتراض کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“

”ٹھیک ہے..... میں کل ہی انکل سے مل کر ساری بات کر لوں گی۔“

”بہت شکریہ آڑھ..... تمہارے بہت احسانات ہیں مجھ پر۔“

”بس جانے دو، اب چلتی ہوں میں..... ان شاء اللہ صبح بات ہوگی۔“

”ٹھیک ہے بہت شکریہ۔ آڑھ اسی وقت چلی گئی۔

رات کے کھانے کے دوران محراب نے مریم بیگم سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”امی ایک بات کرنی ہے آپ سے۔“

”ہوں.....“ کھانا کھاتے ہوئے ہاتھ روک کر انہوں نے محراب کی جانب دیکھا۔

”میں جاب کرنا چاہتی ہوں کسی کے گھر بس چند گھنٹوں کے لیے کھانا پکانا ہے۔“ محراب نے امی کو جواب کے متعلق بتایا۔

”کیوں؟“

”ضرورت ہے امی..... زارون کے آپریشن پر بہت پیسے لگے ہیں، علاج بھی چل رہا ہے، اسے باہر بھی بھیجنا ہے پھر آپ بھی بیمار رہتی ہیں، آپ کی بھی خوراک اور دوائیوں کے لیے پیسے چاہیں۔ زارون کے اکاؤنٹ میں اب زیادہ پیسے نہیں ہیں، آج نہیں تو کل مجھے یہ کرنا ہی ہے۔“

”ہمارے خاندان میں آج تک ایسا کسی نے نہیں کیا بیٹا اور پھر زارون کو پتا چل گیا تو ویسے بھی جان لے لے گا تمہاری۔“

”اب وہ جان لینے کی پوزیشن میں نہیں رہا امی..... ویسے بھی مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔“

”ایسا مت کہو، اب جیسا بھی ہے، تمہارا شوہر ہے وہ۔“ انہوں نے محراب کو سمجھانا چاہا۔

”وہ میری بہن کا قاتل ہے امی..... میں ساری عمر اس کا یہ گناہ معاف نہیں کر سکتی۔“

”میں جانتی ہوں مگر وہ اس کا اور اللہ کا معاملہ ہے، جس نے دنیا میں جو بھی اچھا برا کیا اس کا حساب اسے آخرت میں اللہ کو دینا ہے۔ تم اپنا اور اس کا رشتہ دیکھو..... تمہاری اس کی وجہ سے کوئی پکڑ نہ ہو میری بیٹی۔“ محراب کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔ وہ محض اشہات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

ات کو محراب کمرے میں آئی تو زارون جاگ رہا تھا۔ اس نے اس کے حصے کا کھانا اس کے قریب ہی رکھی میز پر

رکتے ہوئے کہا۔
 ”کھانا کھالو، دوا لینی ہے تمہیں۔“
 ”بھوک نہیں ہے مجھے۔“ بہت مدہم لہجے میں اس نے اسے جواب دیا۔
 ”بھوک نہیں بھی ہے تب بھی کھالو، دوا لینی ہے۔“
 ”تمہیں نہیں لوگے تو زخم کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے۔“
 ”کوئی پروا نہیں۔“

”ہاں تمہیں کیوں پروا ہونے لگی۔ مزے سے بیٹھے بٹھائے ہر چیز جو مل رہی ہے، جب تک چلتے پھرتے تھے تاک میں دم کیے رکھا، اب اپنا ج ہو کر بیٹھ گئے ہو تو میری زندگی زیادہ مشکل کر دی ہے۔ آخر چاہتے کیا ہو تم؟“
 ”محراب تلخ لہجے میں بولی۔ زارون کا چہرہ غصے سرخ ہوا۔
 ”چپ ہو جاؤ، چلاتی ہوئی عورتیں پسند نہیں ہیں مجھے۔“
 ”تمہاری پسند مائی فٹ۔“ اس کا لہجہ مزید سخت ہوا۔
 زارون نے چپ سادھ لی۔
 ”تمہارے بینک اکاؤنٹ میں اتنے پیسے نہیں ہیں کہ میں ساری عمر گھر بیٹھ کر تمہاری دیکھ بھال کرتی رہوں، پہلے دن سے اب تک جتنے بھی پیسے تمہارے علاج پر لگے ہیں سب تمہارے اے ٹی ایم سے نکلے ہیں، ڈاکٹر فرحت نے تمہاری جو رپورٹس باہر بھجوائی تھیں ان کا رزلٹ بھی مثبت آیا ہے اگر تم علاج کے لیے باہر جاتے ہو تو بہت بڑی رقم کا تمہارے پاس محفوظ ہونا ضروری ہے بتاؤ کیا کروں میں؟ کس سے جا کر بھیک مانگوں تمہارے لیے۔“ اس نے بہ مشکل اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

زارون نے چند بل اسے خاصی توجہ سے دیکھا پھر پاس بلا لیا۔
 ”ادھر آؤ میرے پاس۔“
 اس کا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ وہ شدید کشمکش کی شکار ہونے کے باوجود اٹھ کر پاس چلی آئی۔
 زارون نے اس کے پاس چلے آنے پر ہاتھ بڑھا کر

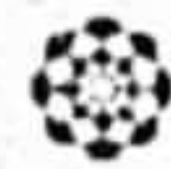
کسی قیمتی متاع کی طرح اسے اپنے اندر سمیٹ لیا۔
 ”زندہ ہوں میں ابھی..... مفلوج ہوا ہوں مرا نہیں ہوں جو اتنی مایوس ہو گئی ہو تم زندگی سے۔“ وہ نرم لہجے میں بولا۔ محراب کا دل بے ساختہ پوری شدت سے دھڑک اٹھا۔

”تم کیا کر سکتے ہو اب؟“
 ”بہت کچھ کر سکتا میں ہوں اب بھی، بس تم میرا ساتھ نہیں چھوڑنا پلیز۔“
 ”مجھے تم سے نفرت ہے زارون۔“
 ”کوئی بات نہیں..... تمہاری اس نفرت کو محبت میں بدل دوں گا میں۔“
 ”مجھے تمہاری محبت کی ضرورت نہیں ہے۔“ بے زاری سے کہتے ہوئے وہ اس سے الگ ہوئی مگر زارون نے اس کا آچل پکڑ لیا۔

”مجھے تمہاری محبت کی ضرورت ہے۔“ اس کا لہجہ آنچ دیتا گھبر تھا۔ محراب لب بلبھینچ کر رہ گئی۔
 ”دیکھو باہر کتنی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے، ابھی معذور نہ ہوتا تو تمہیں اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھا کر باہر لان میں لے جاتا۔ ہم دیر تک واک کرتے مگر فی الحال یہ ممکن نہیں ہے تو ایسا کرو پلیز تم یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ..... تم دھیرے دھیرے میرے بالوں میں انگلیاں چلاؤ، مجھے نیند آ جائے گی محراب۔“ لجاجت سے اس کے ہاتھ ہتھامے وہ نئی منت سے کہہ رہا تھا۔
 ”مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں، پلیز۔“ اس کا ہاتھ تنفر سے جھٹکتی وہ اس کے پاس سے اٹھ کر بیڈ کی دوسری جانب آ گئی۔

زارون اس کی اس درجہ بے اعتنائی پر محض بت بنا اسے دیکھتا رہ گیا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ شمارے میں)



دوستی

نازیہ کنول نازی

digest novels lovers group ❤️

اس کی حسرت ہے جسے دل سے مٹا بھی نہ سکوں
ڈھونڈنے اس کو چلا ہوں جسے پا بھی نہ سکوں
مہرباں ہو کے مجھے بلا لو چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

اپنی دھڑکن کی بات لکھتے تھے
دل کی باتوں کا مان لیتے تھے
چاندنی کی زباں سمجھتے تھے
ایک مدت سے کچھ نہیں کہتے
اپنے خوابوں سے تھک گئے جیسے
اس کی آنکھوں سے تھک گئے جیسے
ایسے خاموشی میں رہتے ہیں
اپنے لفظوں سے تھک گئے جیسے
زارون لوٹ کر رہا تھا عذاب کے لیون پر مسلسل چپ
تھی۔ وہ اسپتال سے ایک ہفتہ ہوا گھر آیا تھا مگر حویلی میں
سے کوئی اس کا حال پوچھنے تک نہیں آیا تھا۔ یہاں تک کہ
اس کی سگی ماں بھی نہیں اور اس بات کا اسے کتنا دکھ تھا یہ
صرف وہی جانتا تھا۔
ایک چہرہ... بچے سے حادثے نے اس پر اس کی حقیقت
کھول کر رکھ دی تھی۔ وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ حویلی میں کیا
حالات چل رہے ہیں۔ علاقے کے سرداروں نے حویلی
کا بائیکاٹ کر دیا تھا، زارون جو بات اپنے گھر کے افراد
سے چھپا کر رکھنا چاہتا تھا وہ بات خوشبو کی طرح پودے

لفظوں کے تھکے لوگ
ایک مدت سے کچھ نہیں کہتے
درد دل میں چھپا کے رکھتے ہیں
آنکھیں ریاں ہے اس طرح ان کی
جیسے کچھ بھی نہیں رہا ان میں
نہ کوئی اشک نہ کوئی اپنا
نہ کوئی غیر نہ کوئی اپنا
چڑیاں ہونٹ پر جمی ایسی
جیسی صدیوں کی پیاس کا ڈیرہ
جیسے کہنے کو کچھ نہیں باقی
دروہنے کو کچھ نہیں باقی
کچھ بھی پہچانتے نہیں جیسے
کون ہے جس سے پیار تھا ان کو
ایک بنام سی رفاقت تھی
سوگھی دھرتی کو ابر سے جیسے
ایسی انجان سی محبت تھی
رنگ بھرتے تھے سادا کاغذ پہ
اپنے خوابوں کو لفظ دیتے تھے

علاقے میں پھیل گئی تھی۔

پہلی آئی تھی۔

”السلام علیکم! کیسی ہو؟“

”وعلیکم السلام! تم سناؤ۔“ پیاز کاٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے اس سے ہاتھ ملایا۔ آئرو نے بھی پیاز اٹھا کر منہ میں رکھ لی۔

”میں الحمد للہ ٹھیک ہوں، تمہاری جانب کا بندوبست کرو یا ہے تنخواہ بھی بہت اچھی ہے۔“

”واقعی.....؟“ محراب کو جیسے یقین ہی نہیں آیا تھا۔
”ہوں واقعی، انکل تم سے ملنا چاہتے ہیں، ملنے کے بعد سارے معاملات طے کر لیں گے۔“

”کب ملنا ہوگا؟“

”جب تم چاہو۔“

”کل؟“

”ہاں..... کوئی مسئلہ نہیں۔“

”کہاں ملائیں گے آفس یا گھر؟“

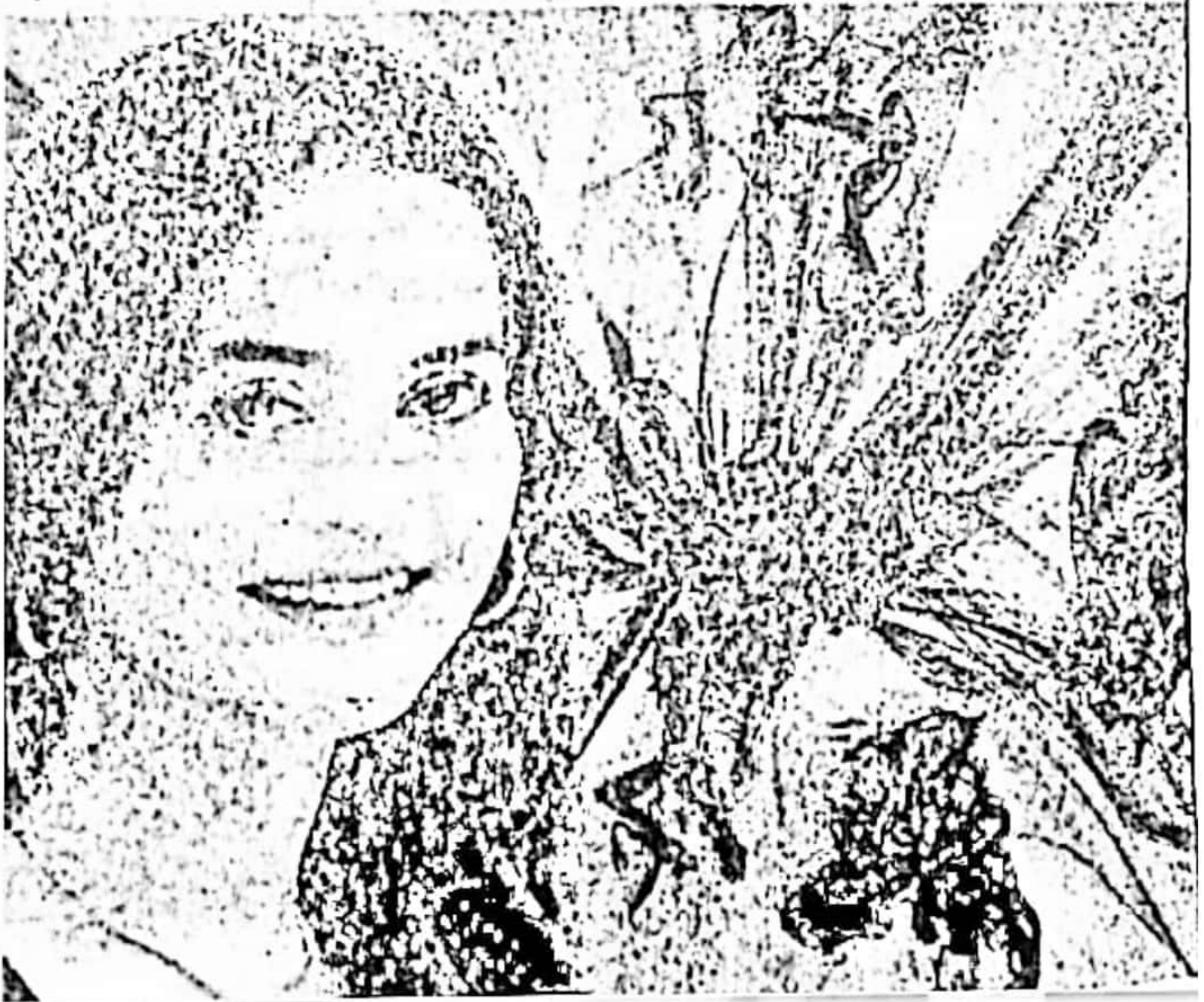
”شیام سات بجے تک آفس میں ہی ملیں گے، ہاں

سر دار عبدالرحیم کے بڑے دونوں بیٹوں کی عزت داؤ پر لگ گئی تھی۔ سر دار عبداللطیف نے بیگم عبدالرحیم پر بھی یہ شرط عائد کر دی کہ اگر وہ زارون سے رابطہ نہیں کی تو انہیں حویلی سے دستبردار ہونا پڑے گا۔

بڑے بیٹوں کے حالات اور چھوٹے بیٹے پر لگی پابندی نے انہیں بستر سے لگا دیا تھا۔ حالات اتنے کبیر ہو گئے تھے کہ سر دار عبدالرحیم کے بڑے دونوں بیٹوں نے اپنی اپنی بیویوں کو وہاں سے نقل مکانی کے لیے تیار رہنے کا حکم دے دیا تھا۔

ایسے میں زارون کی خبر کون لیتا، اس کی مدد کون کرتا؟ جتنی ادویات، ٹیسٹ اور چیک اپ پر بینک اکاؤنٹ تیزی سے خالی ہو رہا تھا مگر زارون کو کہاں احساس تھا ان باتوں کا اسے اب بھی صرف اپنی پسند ناپسند سے مطلب تھا۔

اس روز شام میں جب وہ رات کا کھانا پکارتی تھی آئرو



سات بجے کے بعد اگر تم چاہو تو ہم ان کے گھر چلے جائیں گے۔“

”نہیں شام میں امی اور زارون کو چھوڑ کر جانا مشکل ہے میرے لیے، ہم کل دن میں ہی چلیں گے۔“

”ٹھیک ہے جیسے تمہیں بہتر لگے مائٹی یا زارون بھائی کو کوئی اعتراض تو نہیں۔“

”اعتراض ہے مگر مجھے پروا نہیں، ابھی جن حالات کا مجھے سامنا ہے زارون اسے نہیں سمجھ سکتا۔“

”پھر تو وہ غصہ کریں گے۔“

”کوئی بات نہیں خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے جیسے ٹھان لی تھی۔ آئروہ کندھے آجکا کر رہ گئی تھی۔

اگلے روز زارون اور مریم عظیم کو بلاشتہ کرانے کے بعد کپڑے بدل کر وہ آئروہ کے ساتھ بھائی ائیر مشینز چلی آئی تھی۔

دن کے ساڑھے گیارہ ہو رہے تھے، ہلکی ہلکی ٹکسری ہوئی دھوپ جسم کو راحت بخش رہی تھی۔ تقریباً تین بجیں

منٹ کا سفر طے کر کے وہ لوگ اس بلند و بالا عمارت کے سامنے پہنچ گئی تھیں جہاں اس وقت انہیں جانا تھا۔ آئروہ نے وسیع پارکنگ میں گاڑی پارک کی تو وہ پوچھے بغیر اندر

سکی۔

”ان کا آفس تو بہت بڑا ہے یار، یہ مجھے جیسی ان پڑھ کو بھلا کیوں رکھیں گے جاب پر؟“ آئروہ اس کی بات پر بے

ساختہ مسکرائی۔

”تم ان پڑھ ہو؟“

”تو اور کیا، یہاں تو بہت کوا ایفائنڈ لوگ جاب کرتے ہوں گے، مائٹی ڈگری ہولڈرز۔“

”ہوں..... مگر تمہیں تو یہاں جاب نہیں کرنی ناں تو پھر ایویں مینشن لینے کا فائدہ، انہیں ایک اچھی صاف

ستھری بہترین کھانا پکانے والی شف کی ضرورت ہے، کسی اکاؤنٹ یا سلیز گرل کی نہیں، سبھی۔“ آئروہ کی بات

میں وزن تھا وہ سر ہلا کر گاڑی سے نکل آئی تھی۔ پارکنگ ایریا کس کس کرنے کے بعد وہ عمارت میں

داخل ہوئی تو اور بھی زیادہ متاثر ہوئی۔ اس کے لیے وہ دنیا ایک بالکل نئی دنیا تھا۔

آئروہ اسے ساتھ لیے لٹ کی طرف آئی پھر اس کا ہاتھ تھام کر لٹ میں سوار ہو گئی۔ پانچویں فلور پر ہوائی

صاحب کا آفس تھا۔ لٹ پانچویں فلور پر کی تو باہر نکلتے ہی آئروہ نے اسے ایک طرف گھڑا کر دیا۔

”تم یہیں رکو، میں ریسیپشن سے پوچھ کر آتی ہوں کب تک مل سکیں گے ہم بالکل سے۔“ محراب کے اثبات

میں سر ہلانے پر وہ آگے بڑھ گئی۔

ریسیپشن نبھانے کس طرف تھی، وہ بے ساختہ خود کو نروس محسوس کرنے لگی۔ آئروہ نے ریسیپشن پر اپنا تعارف

کرایا تو اسے فوری ملاقات کی اجازت مل گئی۔ بھاری گلاس ڈور اندر دھکیل کر وہ مکمل اعتماد سے کمرے میں داخل

ہوئی۔

”السلام علیکم! انکل۔“

”آلہ السلام! آؤ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

ہندوستانی صاحب سارا کام روک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ ان کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کیا باتاں ہات ہوئی اس لڑکی سے؟“

”جی انکل، ساری بات ہو گئی ہے آپ بالکل لگرنہ کریں۔“

”کیا بتایا ہے اسے؟“ ہندوستانی صاحب کے لہجے میں بے چینی پک رہی تھی۔ آئروہ مسکرا دی۔

”وہ بھی بتا دوں گی، پہلے آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں، اگر پسند آجائے تو ڈیل کی نہیں تو کوئی اور دیکھ لوں گی۔“

”ٹھیک ہے کتنا پڑھی لکھی ہے۔“

”مگر ریجیوشن کیا ہے ماسٹر مکمل نہیں ہے۔“

”خاندان؟“

”خاندان اب کوئی نہیں، فیملی ٹوٹ گئی ہے اس کی۔“

”سوشل ہے؟“

”نہیں..... بالکل بھی نہیں، کنویں کا مینڈک ہے

ایسی ہونی چاہیے جسے گھر کی چار دیواری کے سوا کچھ نہ ہو۔
 "ہوں..... گز گھر اس کی شادی کا کچھ کرنا پڑے گا۔"
 "اس کی آپ فکر نہ کریں معذور شوہر ہے اس کا کچھ بھی ہو جائے۔ وہ اس کے بچے نہیں آسکتا پھر بھی میں کوشش کروں گی جتنی جلدی ممکن ہو سکے ان کی طلاق ہو جائے۔"

"ہوں۔ یہی بہتر رہے گا۔"
 "چلیں ٹھیک ہے پھر میں اسے لے کر آتی ہوں آپ بس دور کروڑ میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرنے کا انتظام کریں۔"

"شیور" اس بار ہمدانی صاحب مسکرا دیئے تھے۔
 ادھر محراب آ رہے کے بغیر وہاں خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اس کے لیے وہ بلند و بالا عمارت اور وہاں کام کرتے سیکڑوں لوگ بالکل نئے تھے۔

مریم بیگم نے بالکل ٹھیک کہا تھا اس کے گھرانے کی کسی لڑکی کے لیے ایسی ملازمت کرنا آسان نہیں تھا۔
 ابھی وہ ان ہی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی کہ کوئی ہوا کے رتھ پر سوار تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے قریب سے یوں گزرا کہ وہ بہ مشکل گرتے گرتے بچی اوپر سے اس نے اپنا غصہ بھی اسی پر اتارنا۔

"اندھی ہو، نظر نہیں آتا، کیوں بھکاریوں کی طرح راستے میں کھڑی ہو؟" محراب جو پہلے ہی لڑکھڑانے پر کھول رہی تھی۔ اب اس کے الفاظ نے گویا اسے آگ لگا دی تھی۔ تب ہی وہ بولی تو اس کے لہجے میں گویا شعلوں سی چمک رہی تھی۔

"زبان سنجال کر بات کرو نہیں تو اسی زبان کو کاٹ کر کتوں کو کھلا دوں گی میں، مجھے جانتے نہیں ہوتی۔"

"اچھا..... چلو کاٹو میں بھی دیکھتا ہوں کتنی پادر ہے تم میں۔" وہ جو شکل سے ہی کوئی عیاش لگ رہا تھا۔ اب شدید اشتعال میں اس کے مقابل کھڑا اسے چیلنج کر رہا تھا۔ ارد گرد جمع ہوئے لوگ گویا فریز ہو گئے تھے۔

محراب کو اپنی جان مشکل میں پھنسی محسوس ہوئی تب ہی اس نے نفرت سے رخ پھیر لیا تھا۔
 "دفع ہو جاؤ یہاں سے میں تم جیسے بد معاشوں کے منہ اگنا پسند نہیں کرتی۔"

"واش کے کہنا تم نے..... ہوں؟" وہ جو کوئی بھی تھا اس وقت اس کے لیے واقعی وہاں بن گیا تھا۔ محراب کا بازو سختی سے دبوچے ہوئے وہ فریاد کیا۔ تب ہی آ رہ وہاں آئی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ حیران ہوئی، محراب نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا۔
 "ہا نہیں کون پاگل ہے خواخواہ گلے پڑ رہا ہے میرے۔"

"شٹ اپ۔" اس بار وہ چلایا۔ آ رہ نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"سوری شہریار بھائی، میری دوست ہے آپ کے بارے میں پتا نہیں اسے۔"

"چپ کر آ رہ کیا پتا نہیں ہے، فخر لگا ہے یہ کہیں پر جو پتا نہیں ہے اس کا۔" جذباتی وہ ہمیشہ سے تھی۔ اس بار آ رہ نے اس کا ہاتھ دبایا۔

"جیب کرو تم، چلو یہاں سے۔" تقریباً کہتے ہوئے وہ اسے وہاں سے دبا لے آئی تھی۔

شہ بار ہمدانی جڑے بیٹھتا اسے غصے سے دیکھتا آگے بڑھ گیا۔ ایک تو اس کا موڈ اپنی بیٹی کی وجہ سے پہلے ہی آف تھا اوپر سے اس لڑکی نے مزید خراب کر دیا تھا۔ آ رہ اب محراب پر غصہ کر رہی تھی۔

"کیا ضرورت تھی تمہیں شہریار بھائی سے الجھنے کی؟"
 "مجھے ضرورت تھی، وہ نکرایا تھا مجھ میں۔"

"تو کیا ہوا نظر انداز کر دیتیں، تمہیں پتا بھی ہے وہ کون ہے؟"

"کون ہے۔"

"ہمدانی انکل کے اکلوتے بیٹے، ابھی کل ہی بزنس ٹرپ مکمل کر کے وطن واپس لوٹے ہیں، بیٹی بہت بیمار

جہان کی اس وجہ سے پریشان ہیں۔
 "تو میں کیا کروں، مجھ سے زیادتی برداشت نہیں ہوتی۔"

زارون نے ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھی ساری دوائیں زمین پر گرا دیں۔

"اس سے بہتر تمام مجھے کوئی شکل لادیتیں اور میں باہر جا کر بھیک مانگ لانا اگر اتنے ہی بڑے حالات ہو گئے ہیں تمہارے۔" وہ تکلیف میں تھا مگر محراب اس کی تکلیف کا اندازہ نہیں لگا سکتی تھی تب ہی آنسو پونچھتے ہوئی خفی سے بولی۔

"یہ سب تمہیں حالات بگاڑنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔"

"قائد ہواٹھارہوی ہو تم میرے بگڑے حالات کا؟"

"کہاں گئی تھیں تم؟" مریم بیگم کو جاب کی خوشخبری سنا کر وہ زارون کو دوا دینے آئی تو اس نے پوچھ لیا۔

سرخ نہم آنکھیں اس کی بے چینی اور اضطراب کی گواہ تھیں۔ محراب نے بے ساختہ نظریں چرائیں۔ میز پر پانی کا گلاس رکھتے ہوئے اس کا دل روز سے دھڑکا تھا۔

"کچھ پوچھ رہا ہوں میں تم سے۔" اس کی خاموشی پر وہ دوبارہ بولا۔ محراب کو ہمت کرنی پڑی۔

"جواب کے لیے انتظار دینے گئی تھی اور جواب مل گئی۔" جھوٹ بولنے کی اس میں ہمت نہیں تھی اس لیے سچ بول دیا۔

زارون کی آنکھوں میں جیسے چند لکھوں میں ہی خون اتر آیا تھا۔

"منع کیا تھا میں تمہیں اس کام کے لیے پھر کیوں نکلیں؟" اس کا ضبط جیسے جواب دے رہا تھا۔ محراب نے رخ پھیر لیا۔

"تمہارے منع کرنے سے مسائل حل نہیں ہوتے۔"

"مسائل حل نہیں ہوتے تو اپنا سودا کرو کی تم، بولی لگواؤ گی اپنی؟" وہ چلایا اتنی شدت سے کہ محراب کو بے ساختہ اپنا دل رکنا محسوس ہوا۔

"جہیں..... جہیں بتایا ابو کی قسم تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" وہ اپنی پوری کوشش کر رہی تھی، چھری اس کے ہاتھ سے چھین لینے کی، اسی کوشش میں کب اس کا بازو زرد میں آ گیا اسے پتا چلا نہ زارون کو، خون کی ایک تیز دھار نے زارون کے دونوں ہاتھ رنگین کر دیئے تھے۔ اس کا سارا جنون وہیں ختم کیا تھا۔ محراب کا چہرہ اب تکلیف کے حصار میں تھا، اس نے بے قراری سے اس کا بازو تھام لیا

حجاب کرچی

محبت نظر کی آیتوں سے خون آگاہی فرماتا ہے

محبت نظر کی آیتوں سے خون آگاہی فرماتا ہے

خاندانی رسم و رواج کس طرح لڑکیوں کو باقی کرتا ہے
مادر اطلحہ کے نوک قلم نگلی ایک خوب صورت تحریر

محبت نظر کی آیتوں سے خون آگاہی فرماتا ہے

رشتوں میں اپنی مفاد کے لیے زہر جھول و انوں کا قصہ حیات
جو خود تو تاجی کی طرف تیز سے دوڑ رہے ہوتے ہیں اور اپنے
ساتھ کئی اور رشتوں کو بھی: سمائی نقصان پہنچا رہے ہوتے ہیں

محبت نظر کی آیتوں سے خون آگاہی فرماتا ہے

ذاتی معیاری شاعری پر مبنی سلسلہ

اس کے علاوہ
محبت نظر کی آیتوں سے خون آگاہی فرماتا ہے
محبت نظر کی آیتوں سے خون آگاہی فرماتا ہے
محبت نظر کی آیتوں سے خون آگاہی فرماتا ہے

Info@naeyufa.com

0300-8264242

تھا۔
”کیوں میری جان لینے پر تکی ہو تم محراب؟“ تنہی
اذیت تھی اس کی آنکھوں اور لہجے میں، اس نے بس ایک
نہرا سے دیکھا پھر آہستہ سے اپنا بازو اس کی گرفت سے
کل لیا۔

”تم ہمیشہ میرے لیے تکلیف کا باعث بننے ہو
زارون عبدالرحیم، کاش تم پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے۔“ روتی
ہوئی سی وہ اس کا دل لوج گئی تھی۔ زارون نے بہت بے
بسی سے میز پر زور دار مکار سید کیا۔ اس رات کھانا مریم
بیگم نے پکایا تھا۔ آدھی تو وہ ہاتھ رومال میں لپیٹے بیٹھی
تھی۔ وہ چوکی۔

”کیا ہوا؟“
”کچھ نہیں یونہی معمولی سی چوٹ لگ گئی؟“
”اوہ پھر تو تم کل سے جاب پر نہیں جاسکو گی؟“
”ہوں..... ابھی دو تین دن مشکل ہے۔“
”زارون بھائی نے کوئی ہنگامہ تو نہیں کیا؟“
”نہیں..... بس وہ چپ ہیں۔“

”چلو یہ بھی اچھا ہے، اب دیکھو ناں آج کل کے دور
میں کون ایسی لڑکی ہوگی جو ایک معذور، مفلس مرد کو اپنے
سر پر سوار رکھ کر خورد و بدر کے دھکے کھاتی ہوگی۔ بھئی میں تو
کہتی ہوں اس سلسلے میں تمہاری سوتن تم سے زیادہ سمجھدار
نکلی، خلع کا کیس دائر کر دیا اس نے۔“

”کرتی رہے میرا اس کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں۔“
”ہوں..... ہو بھی سکتا ہے، اسے زارون بھائی کی
دولت سے محبت تھی اور تمہیں ان کی ذات سے، فرق تو
ہے ناں۔“

”تمہیں کس نے کہا مجھے اس کی ذات سے محبت
ہے؟“

”تو پھر نہیں ساتھ رکھنے کا مقصد؟“
”کوئی مقصد نہیں، صرف رشتہ بھاری ہوں بس۔“
”اس کا مطلب ہے اگر تمہیں زارون بھائی سے کوئی
بہت بہتر شخص ملتا ہے تو تم انہیں آزاد کر دو گی، ہے ناں۔“

”جیسے غواہی نہیں ہے، نہ ہی بہتر قسم کی اور پلیز

ٹائپ تیار کر دو، جیسے کسی ہائیکس ایچ ایچ نہیں لگائیں۔“

”پہلے لھیک ہے، میں چاہتی ہوں پھر انکل کو ڈاؤن کی تم

ابھی دو تین دن نہیں آسکو گی؟“

”بڑھ چاؤ کھانا کھا کر جانا۔“

”نہیں یاد ابھی بھوک نہیں ہے، چلتی ہوں اب

ہائے۔“ وہ جلدی میں تھی محراب نے بھی زیادہ اصرار نہیں

کیا۔ مریم زنگم نے اسے کھانا کھلا دیا تھا۔ اس کے جاگنے

تک وہ ان کے ساتھ ہی رہی، ان کے سولے کے بعد وہ

زارون کے لیے کھانا انکل کر اس کے کمرے میں آئی۔

زارون بستر پر جھک لگا، بے چارہ سگریٹ کا زہریلا

دھواں اپنے اندر اتار رہا تھا۔ محراب نے ایک نظر اسے

دیکھا پھر کھانا میز پر رکھ دیا۔

”کھانا کھاؤ۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”بھوک کیوں نہیں ہے، کل سے کچھ نہیں کھایا تم

نے، ایسے تو ذمہ کسی لھیک نہیں ہوں گے، کل چیک اپ

کے لیے بھی جانا ہے۔“

”مجھے کیس نہیں جانا، میری ماں جنا بند کر دو تم۔“ وہ ہلکا

بیٹھا تھا۔ محراب پاس چلی آئی۔

”کیا چل رہا ہے تمہارے دماغ میں، کیوں نہیں

سکون سے زنگم کی گزارتے؟“ اپنے اسی مزاج کی وجہ سے

سب کچھ گنوا دیا تم نے، اب بھی قتل نہیں آئی، اب بھی

وہی مظننہ ہاتی ہے۔“

”تو کیا کروں، بے غیرت بن جاؤں، اپنی بیوی کو

لوگوں کے گھروں میں بھیج کر خود دالوں کی طرح گھر

چینے اس کی کمائی کھاؤں، یہی چاہتی ہوں تم۔“

”کیا مطلب ہے اس میں، ہزاروں لڑکیاں جاب کرتی

ہیں، مگر چلتی ہیں، سب شوق تو نہیں کرتی ماں ان کے

حالات مجبور کرتے ہیں انہیں، گھر سے باہر قدم نکالنے پر،

میرے بھی ہاتھ اس وقت خالی ہیں، میرے بھی حالات

میرا ساتھ نہیں دے رہے، جب تم لھیک ہو جاؤ گے سب

چھوڑ دوں گی۔“

”اس کی نو بہن نہیں آئے گی، میرے پیٹے جی تم کسی

بھی مجھ سے نہیں گھر سے باہر نکالی کر لے کے لیے نہیں

جاؤ گی بس۔“

”تو لھیک ہے تم ٹرچہ اٹھاؤ، میں بیٹھ جاتی ہوں

کمر۔“

”اٹھاؤں گا، اپنے دوستوں سے بات کی ہے میں

نے کوئی نہ کوئی مل انکل آئے گا، تمہیں میرے علاج کے

لیے لکھ مند ہونے کی ضرورت نہیں، مجھے فی الحال علاج

کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”تم ایسے کیوں ہو زارون، اتنے ضدی کیوں ہو تم؟“

وہ زچ ہوئی، زارون نے لب پہنچ لیے۔

”بس ایسا ہی ہوں میں۔“

”لھیک ہے، اب جو بھی ہو گا اس کے ذمہ دار صرف تم

خود ہو گے۔“ براہی سے کہتی وہ وہاں سے اٹھ گئی۔

زارون نے سر پھر پیچھے پھینکے سے اٹھا کر آ لکھیں موند

لیں۔ اگلے دو دن خاموشی کی غمزدہ ہو گئے تھے۔ تیسرے

دن رات میں زارون کی ہائیکس ٹائپ میں اتنا شدید درد

اٹھا کہ وہ مضبوطی کے باوجود کراہ کر رہ گیا۔

رات دو بجے سے صبح پانچ بجے تک اس نے پھلکی کی

طرح کرتے ہوئے رات گزار لی تھی اوپر سے غزالہ نے

اگ وقت ڈال دیا تھا۔

عدالت میں خلع کے کیس کے ساتھ اس نے اپنا اور

اپنے بچے کے مان نفقہ کے لیے بھی کیس دائر کر دیا تھا۔

عدالت میں جمع کرائی گئی درخواست کے مطابق وہ امید

سے تھی اور اسے اپنے بچے کے حق کے لیے اس کے باپ

یعنی زارون عبدالرحیم سے پیسہ و کار تھا۔

زارون کو یہ خبر اپنے دوست کی توسط سے ملی تھی اور اس

کا بس ۔۔۔ رہا تھا کہ وہ ہر چیز فنا کر ڈالے۔

نہ اب مانتے لے کر آئی تو وہ غزالہ کا نمبر پر بس کر رہا

تھا۔ پہلی بار کی رات وہ ایک لمحے بھی سکون سے نہیں سو

سکا تھا۔ نکل جا رہی تھی مگر وہ جان بوجھ کر اس کی کال کاٹ

رہی تھی، پک نہیں کر رہی تھی۔ (زارون کا چہرہ اس لمحے جیسے کسی انکار سے لہجہ نکلتا تھا۔)

ہار ہار کوشش کے بعد آٹا خرغزالہ نے اس کی کال پک کر لی تھی۔

”کیا مصیبت ہے، کیوں ہار ہار تک کر رہے ہو مجھے؟“ کال پک کرتے ہی وہ خرابی۔

زارون کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کے پاس جا کر اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ وہ بولا تو اس کے لہجے میں گویا انکاروں کی پیش تھی۔

”تم ایک کم ظرف، گھٹیا لڑکی ہو، مجھے اس ہارے میں ایک ایسا بھی شک نہیں تھا پھر ثابت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ اس کے پیش پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”اف کتنے اچھے لگ رہے ہو یوں بے بسی سے دھمکی دیتے ہوئے، لگتا ہے ابھی تک مشکل ٹھکانے نہیں آئی تمہاری۔“

”کیا چاہتی ہو؟“ وہ ضبط کی انتہا پر تھا۔ خزانہ کو اچھا لگا تب ہی مزے سے بولی۔

”روتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں تمہیں اپنے پاؤں میں بٹھا کر۔“

”کیوں؟“

”یاد نہیں تمہیں اس روز گاڑی میں کتنی حقارت اور غرور سے تم نے کہا تھا کہ میں کسی کو تمہارے ساتھ اپنے نکاح کا نہ بتاؤں نہیں تو تم ایک پل نہیں لگاؤ گے مجھے میری اوقات یاد دلانے میں، اب بتاؤ تمہیں تمہاری اوقات یاد آئی کہ نہیں۔“ مریج مسالا لگتا اس کا لہجہ زارون کو پاتال کی اتھاہ گہرائیوں میں لے گیا تھا۔

”ہمیشہ میں نے تمہاری ضرورت پوری کی اور بدلے میں ہمیشہ تم نے مجھے ذلیل کیا۔ اب وقت بدل گیا ہے زارون عبدالرحیم، ذلیل ہونے کی باری اب تمہاری ہے۔“ جتنا وہ اس کا خون جلا سکتی تھی جلا رہی تھی۔

زارون کو اس لمحے سے پہلے بھی اپنی معذوری پر اتنا غصہ نہیں آیا جتنا اس وقت آ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا

تھا وہ اس جتنا تک بھری لڑکی کو جوتے تلے مسل کر رکھ دے۔

”جوتے تلے، جتنا مرضی دلیل کر سکتی ہو کرو، مکمل چھوٹ۔“ یہ نہیں مگر ایک بات یاد رکھنا لڑکی شیر زیادہ خطرناک آتا ہے جس دن میں وہ ہارہ اپنے ہیروں پر کھڑا ہو گیا تمہیں ساری دنیا میں سر چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی۔“

”اچھا..... پہلے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو تو پھر دھمکی بھی دے دیتا۔“ وہ پھر ہلسی۔ زارون نے موہاٹل غصے سے سامنے دیوار پر دے مارا۔

اس نے بھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس پر ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب وہ اتنا بے بس ہو جائے گا کہ خود پر ہنسنے والوں کو سزا بھی نہیں دے پائے۔ محراب نے نظر پھیر کر موہاٹل اسکرین کے ٹکڑوں کو دیکھا پھر اس کے رستے زخموں کو۔

”تمہارے زخم رس رہے ہیں، تمہیں علاج کی ضرورت ہے۔“ مدہم لہجے میں اس نے اس کی توجہ بٹانی چاہی۔ زارون اس پر فقط اک نگاہ ڈال کر رہ گیا۔

کل رات سے وہ جس تکلیف کے حصار میں تھا صرف وہی جانتا تھا۔ لہذا مانا چاہتے ہوئے بھی اس وقت ایسے پختہ کرپ کے لیے جانا پڑا تھا۔ ڈاکٹر فرحت نے تفصیلی چیک اپ کے بعد اس کی کلاس لینا ضروری سمجھا۔

”کیا بات ہے مسٹر زارون، میں نوٹ کر رہا ہوں آپ صحت یاب ہونے میں دیکھی نہیں دکھائے دے رہے؟“ ڈاکٹر فرحت کے سوال پر اس نے بے ساختہ نظر چرائی تھی۔

”کتنی حیرت کی بات ہے کہ یہ پتا ہونے کے باوجود کے آپ ٹھیک ہو سکتے ہیں پھر سے اپنے ہیروں پر چل سکتے ہیں آپ کو اپنے علاج میں دیکھی نہیں، کیوں؟“ وہ پوچھ رہے تھے مگر زارون کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا لہذا وہ خاموش بیٹھا رہا۔ تب ہی انہوں نے

حاموں کی غراب سے نبرد

زیادہ لگ رہا تھا۔ صفائی اتنی کہ ماربل کی ٹائیلوں میں وہ اپنا چہرہ دیکھ سکتی تھی۔

”مہن کا خیال رکھیں مس محراب، جتنی لاپرواہی یہ اپنے زخموں میں دکھا رہے ہیں ان کے لیے بے حد نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے اگر ان کی ٹانگ کے زخم جلدی خشک نہ ہوئے یونہی بگڑتے رہے تو آپ جانتی ہیں ماں، کیا ہو سکتا ہے، ٹانگ کانٹا پڑ سکتی ہے اور ٹانگ کاٹنے کا مطلب ہے ساری زندگی کے لیے اپنا جح ہو کر رہنا، آپ تصور کر سکتی ہیں یہ کتنا تکلیف دہ ہوگا، اس صورت میں جبکہ ان کے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔“ وہ صبح کبہ رہے تھے محراب نے اجابت میں سر ہلا دیا۔

”کوشش کریں، جتنی جلدی ہو سکتا ہے ان کے زخم
خسک ہو جائیں تاکہ ہم انہیں مزید بہتر ٹریٹمنٹ کے لیے
باہر بھجوا سکیں۔“
”جی ڈاکٹر۔“

”شکریہ، ان کی دواؤں کا خاص خیال رکھیں ایک دن بھی تاخیر نہ ہونے پائے۔“

”جی ان شاء اللہ۔“ وہ یہی کہہ سکتی تھی مگر نہ حقیقت میں اس نے زارون عبدالرحیم پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ گھر واپسی کے سفر میں زارون معمولی سے زیادہ خاموش تھا۔ اس رات اس نے دوا لینے میں کوئی غور نہیں کیا تھا۔ پوری رات وہ بیڈ کے کنارے پر ایک ہی کروش لے لے چپ چاپ سویا رہا تھا۔ شاید غزالہ نے جو حرکت کی تھی اسے اس نے زیادہ سی دل پر لے لیا تھا۔ دیکھنے ایک ہفتے سے شیو بھی بڑھ گئی تھی مگر اسے جیسے کوئی احساس ہی نہیں تھا۔

جینک میں جو پیسے بچے تھے محراب نے اس کی دوائیں اور کچھ گھر کے لیے راشن خرید لیا تھا۔ اس روز ناشتے کے بعد وہ زارون کو دوا کھلانے کے بعد مریم بیگم کو بتا کر ہمدانی ہاؤس چلی آئی تھی۔ آئندہ ساتھ بھی لہذا کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔

شمار تھا۔ تقریباً پانچ کنال پر پتا گھر..... گھر کم کوئی محل

چونکہ آترہ اس کے ساتھ تھی لہذا اسے گھر کے اندر رکھ جانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی اس گھر میں بے شمار نوکر تھے مگر اپنے کام سے کام رکھنے والے کسی کو کسی دوسرے ملازم کے کام یا ذات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ہمدانی صاحب ابھی گھر پر ہی تھے لہذا آترہ اسے ساتھ لے کر ان کے پاس چلی آئی۔

”السلام علیکم! انکل صبح بخیر۔“

”السلام علیکم! انکل مسیح بخیر۔“

ابھی آفس کے لیے نکلنے ہی والا تھا۔ "وہ چونکہ ٹائم کے پابند تھے تو آفس کے لیے بھی کبھی لیٹ نہیں ہوتے تھے۔"

آترہ مسکراتے ہوئے وہیں لان میں ان کے سامنے
کیبن کی کرسی پر بیٹھ گئی ساتھ ہی محراب کو ہٹا لیا۔

”میری دوست جاب شروع کرنا چاہتی ہیں انکل، اسی لیے ساتھ لے کر آئی ہوں۔“ ہدانی صاحب کا وقت قیمتی تھا لہذا اس نے ادھر ادھر کی باتوں میں ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ محراب اس دوران سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔ ہدانی صاحب نے کہا۔

”گلد..... جالب کا تو قسم نے انہیں بتا ہی دیا ہے کیا کرنا ہوگا بس میں چاہتا ہوں مجھے شہر بار اور اس کی جی کی طرف سے کوئی شکایت نہ ملے۔“

”ختم نہیں ملے گی، میری دوست بہت سمجھدار ہے،
بڑے بڑے بھوتوں کو قابو کر کے رکھا ہوا ہے اس نے۔“ وہ
ہنسی اور محراب کو اس کی یہ ہنسی بے خد غیب لگی۔

”بھلا اس کی کھانے پکانے کی جاب سے کسی کو قابو کرنے کا کیا اطلاق؟“ اس نے دل میں سوچا۔

”ایک اور بات کا خیال رکھنا ہوگا، بلا ضرورت کسی بھی میل میں طماز م یا طماز مہ سے بات چیت کرنے کی قطعی اجازت نہیں ہوگی۔“ اہالی صاحب کی طرف سے گویا وارن کیا گیا تھا۔ محراب نے آہستہ سے اثبات میں

سر ہلایا۔

”کب سے کب تک یہاں رہنا ہوگا؟“ اسے
جواب کچھ خاص اچھی نہیں لگ رہی تھی مجبوری تھی کہ کئی
الوقت اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔

اسے ضرورت بھی کیا تھی کسی سے بلا وجہ فری ہونے
کی اسے تو صرف اپنی تنخواہ سے مطلب تھا۔ باقی ہر چیز
اس کے لیے بے معنی تھی۔

”ہاں نیا، ہم سوال ہے تو ایسا ہے محراب کہ شہر یار بھائی
صبح چار بجے کے قریب گھر آ کر سوتے ہیں تو ایک بچے
تک بچہ کمر باندھ کر رہتے ہیں، ان کی بیٹی کی بھی یہی روٹھن
ہے تو شام آرام سے دوپہر کے کھانے کی تیاری کر کے
آ سکتی ہو اور شام چار پانچ بجے تک شہر یار بھائی کے گھر
سے نکلتے ہی چھٹی کر کے جاسکتی ہوں کھیل۔“

”چلو ٹھیک ہے میں اب آفس کے لیے لکھا ہوں تم
آنے جانے کا وقت بتا دینا انہیں۔“ اگلے ہی پل کھڑے
ہوتے ہوئے انہوں نے گویا بات سمیٹ دی تھی۔
آئروہ نے سر ہلا کر انہیں اطمینان دلایا۔ ہمدانی
صاحب کے وہاں سے رخصت ہونے کے بعد وہ محراب
کی طرف متوجہ ہوئی۔

”بیوی نہیں ہے ان کی؟“

”بیوی ہے مگر دونوں ساتھ نہیں رہتے، اصل میں
شہر یار بھائی کی بیوی ہمدانی انکل کے سب سے بڑے
بزنس حریف کی بیٹی ہے، کسی زمانے میں دونوں دوست
تھے تو رشتہ طے کر دیا بعد میں دشمنی ہو گئی تو رشتہ بھی ختم،
شہر یار بھائی نے رشتہ ختم نہیں کیا، انکل کے خلاف جا کر
انہوں نے اس لڑکی سے شادی کر لی چار سال دونوں
ٹھیک چلے بعد میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے شروع
ہو گئے تو وہ چھوڑ کر چلی گئی اور بھائی یہاں آ گئے، بس اسی
وجہ سے مزاج بھی سوانیزے پر رہتا ہے ان کا۔“

”دیکھو محراب ہمدانی انکل بہت اچھے انسان ہیں،
یوں سمجھو کہ خوش نصیب لوگوں کو ان کے ہاں ملازمت ملتی
ہے مگر ایک بات ہے ان کے کچھ اصول ہیں وہ تمہیں فالو
کرنے ہوں گے۔“

”کیسے اصول؟“ محراب کو حیرانی ہوئی۔

”سب سے پہلا اصول تو یہی ہے کہ بلا وجہ کسی سے
دعا سلام نہیں کرنی اور دوسرا اصول دوران ملازمت جو حکم
تمہیں انکل یا ان کے بیٹے کی طرف سے دیا جائے تم
اسے فوراً بجالاؤ گی۔ کام چور، نکلے لوگ انکل کو پسند نہیں
اور تم سب سے اہم اصول تم اپنی طرف سے جتنی مدت
یا وقت جا بجا کرنا چاہو تم اس کی پابند ہوگی کہ اس وقت
کے دوران تم ملازمت چھوڑ کر نہیں جاؤ گی کیونکہ اس طرح
پھر مالک لوگوں کو مسئلہ ہوتا ہے وہ فوری طور پر نئے بندے
کا انتظام نہیں کر سکتے۔“

”ہوں کافی دلچسپ کہانی ہے۔“

”بس کہانیاں تو تمہیں روز ملیں گی یہاں مگر تم نے
بس ثابت قدمی سے ڈٹے رہنا ہے، ہمت نہیں ہارنی اور
پچھہ گم کی فکر تو بالکل نہیں کرنی میں ہوں ناں، میں آنٹی
نکے۔ آپ ان کی بیٹی جیسی ہوں، ایک لمحے کے لیے بھی
اکلی نہیں چھوڑوں گی انہیں۔“ وہ بات بات پر اسے سلی
دے رہی تھی۔ محراب کی آنکھیں اس کی اس درجہ محبت پر
بھرا آئیں۔

”ٹھیک ہے، کام کیا کرنا ہوگا مجھے؟“

”کام وہی کھانا پکانا، اصل میں ہمدانی انکل کے پاس
تین چار شیف ہیں بہترین کھانا پکاتے ہیں مگر تمہیں بتایا
تھاناں، ان کا بیٹا بڑا کھڑوس ہے ذرا جو کوئی چیز ناک تلے
آ جائے اس کے اور اس کی بیٹی کے، بس اسی لیے انکل
چاہتے ہیں کہ کوئی ایسی ضرورت مند شیف مل جائے جو
اس کے ٹخڑے برداشت کرے اور جیسا وہ کہے دیا
پکادے خواہ تین کا تھوڑا کھانا کتا ہے وہ۔“

”تم کتنی اچھی ہو آئروہ، سمجھ میں نہیں آتا کیسے تمہارا
شکر یہ ادا کروں، اتنا تو نایاب ہوتی شاید وہ بھی میری لیے
نہ کر پائی جتنا تم نے کیا ہے۔ تم بہت عظیم ہو آئروہ آج کل
ایسی دوست ملنے ناممکن ہیں۔“

”اب تم شرمندہ کر رہی ہو مجھے۔“ محراب کے الفاظ

پرایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی تھی۔
محراب نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ اس کی نظر میں وہ اس کے لیے واقعی کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔

طلوع شمس مفادقت ہے
پرائی کر نہیں
نئے مکانوں کے آنکھوں میں لرز رہی ہیں
لیصل شیر وفا کے روزن
جکتے ذروں سے بھر گئے ہیں
مگے دلوں کی عزیز باتیں
نگار صبح، گلاب راتیں
بساط دل میں بھی جیب شے ہے
ہزار جیتیں ہزار باتیں
جدائیوں کی ہوائیں لحوں کی خشک مٹی اڑا رہی ہیں
گئی رتوں کا مال کب تک
چلو کہ شاخیں تو ٹوٹتی ہیں
چلو کہ قیروں پہ خون رونے سے اپنی آنکھیں ہی
پھوٹتی ہیں

یہ موڑ وہ ہے جہاں سے میرے
تمہارے بدلتے بدل گئے ہیں
پرائی راہوں کو لوٹنا بھی ہماری تقدیر میں نہیں ہے
کہ راستے بھی ہمارے قدموں کے ساتھ آگے نکل
گئے ہیں

طلوع شمس مفادقت ہے
تم اپنی آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے ستاروں کو
موت دے دو
گئی رتوں کے تمام پھولوں، تمام خاروں کو موت
دے دو

نئے سفر کو حیات بخشو
کہ پچھلی راہوں پہ ثبت جتنے نقوش پائیں
غبار ہوں گے
ہوا اڑائے کہ تم اڑاؤ.....

اس نے زاہد اور گھر کے لیے جاب کی تھی اور

جاب کے پہلے ہی دن اسے احساس ہو گیا کہ اس سے ملنا
فیصلہ سرزور ہو چکا ہے۔
ہمائی صاحب کی پوتی کوئی عام بچی نہیں تھی شیطان
کا سایہ تھی، صبح اٹھتے ہی اس نے محراب کو کھپانا شروع
کر دیا تھا۔ کبھی کبھڑی کھانی ہے تو کبھی پاستا، وہ محنت سے
بنا کر لاتی تو ایک کچھ کھاتے ہی اسے اندازہ ہو جاتا کہ وہ
ٹھیک نہیں بنا لہذا اب کوئی اور ڈش بنا کر اس کے حضور
پیش کی جائے بات صرف یہیں تک رہتی تو بھی ٹھیک تھی
مگر بھری پلیٹ کو ریجیکٹ کر کے وہ قیمتی قالین یا دیوار پر
دے مارتی تھی اور اس کی صفائی میں جو اسے جان کھپاتی
پڑتی وہ کوئنگ سے زیادہ محنت طلب کام تھا۔

عجیب بے بسی تھی کہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتی تھی کہ بچی کو
اس کا بتایا ہوا کچھ بھی پسند نہیں آ رہا تھا۔ حالانکہ وہ اپنی
پوری محنت اور توجہ سے سب بنا رہی تھی۔ اسی لیے نہیں
چاہتی تھی کہ پہلے ہی دن ریجیکٹ ہو کر گھر چلی جائے۔
دانش نے عجیب مشکل میں پھنسا دیا تھا اس کے
سارے راستے تاریک ہو گئے تھے۔ تین بجے کے قریب
شہر یار سوکراٹھا تو سب سے پہلی فکر اسے اپنی بیٹی کے کچھ
کھانے کی تھی جو اپنے کمرے میں بھوکی پیاسی موڈ آف
کیے بیٹھی تھی۔

”پری“ اسے آواز دیتا وہ کمرے میں آیا تو سامنے
بیڈ پر وہ رو رہی تھی اس کی جیسے جان نکل گئی۔
”پری کیا ہوا میری جان، رو کیوں رہی ہو؟“ لحوں
میں اسے سینے سے لپٹاتے ہوئے وہ جیسے بے کل ہوا تھا۔
پری کی شکایتیں شروع ہو گئی تھیں۔
”بڑے پاپا نے پھر میڈ بدل دی پاپا، مجھے اس کا بتایا
ہوا کچھ بھی نہیں کھانا۔“

”کیوں؟“
”بس مجھے اچھی نہیں لگی وہ۔“
”کیوں..... اچھی کیوں نہیں لگی، کیا اس نے ڈانٹا
آپ کو؟“
”نہیں..... ڈانٹا نہیں پر وہ ماما جیسی دکھتی ہے، آپ کو

ہتا ہے ہاں آلی بیٹ ماما۔ اس نے اصل وجہ بیان کر دی۔

شہریار کے لب بھینچ گئے۔ نفرت تو وہ بھی کرتا تھا اس بے حس سے جو ایک معمولی سی بات پر اس کی ساری محبت، سکھ و آرام کو ٹھوکر مار کر چلی گئی تھی مگر اس کی بیٹی کی نفرت شاید اس سے بھی کہیں بڑھ کر گئی کہ اسے اس کا کوئی ہم شکل بھی پسند نہیں تھا۔

”اُدکے، میں آپ کے بڑے پاپا سے بات کرتا ہوں، ہتا نہیں کس کو رکھ لیا انہوں نے۔“ دھیسے لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے اس نے فوری جیب سے موبائل نکالا۔

”ہمدانی صاحب نے دوسری نسل پر اس کی کال پک کر لی۔“

”کیوں؟“ دوسری طرف وہ بے چین ہوئے تھے۔

”میڈ جو تبدیل کنڈی سب آپ نے اس کی۔“

”مجبور کی بھی بیٹا میں سے کچھلی جوڑ کی بھی پتھر کا بادل ہے مارا تھا پری نے اس کے منہ پر شکر کرنا کلمہ سچ گئی مگر چیشانی پر گہرا زخم آیا تھا۔ کسی بھی قیمت پر جاب کے لیے تیار نہیں تھی وہ تم ہی بتاؤ کیا کرتا میں؟“

”اس سے سوری کر لیتے بڑے پاپا، مجھے بس غصہ آ گیا تھا۔“ پری نے موبائل کے اسپیکر سے نکلتی ان کی آواز سن لی تھی، موبائل اپنے باپ کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولی تو وہ کھل کر ہنس دیے۔

”سوری کی تھی بیٹے مگر وہ بہت ڈر گئی تھی، اب جوئی آئی ہے ہاں یہ اس سے بھی اچھی ہے۔“

”مجھے اچھی نہیں لگی۔“

”چلو کوئی بات نہیں بڑے پاپا کو تھوڑا ٹائم دو وہی پرانی دالی دوبارہ آ جائے گی خوش۔“

”جی پاپا لویو۔“ مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے موبائل باپ کو واپس کر دیا۔

ادھر ہمدانی صاحب نے فوراً آ کر وہ کال ملائی تھی۔

”ہاں آ کر وہ بیٹے دو کروڑ تمہارے اکاؤنٹ میں ڈال کر دیے ہیں اب تم نے اپنے حصے کا کام کرنا ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں اکل، اسی مہینے کی آخری تاریخ پہنچے ہیں، میں نے ایبرو ڈ جانا ہے، جانے سے پہلے آپ کا کام ہو جائے گا۔“

”نہیں اتنا انتظار نہیں کر سکتا میں، اتنے دن تک تو شہریار کا سر سوجھ کھائے گا مجھے، اس کی بیٹی مکمل طور پر اس کی نگہ میں ہے، وہ کسی بھی وقت میری ساکھ اور کاروبار کو نقصان پہنچا سکتے ہیں، تمہارے پاس بس یہی ایک ہفتہ ہے جو بھی کرنا ہے فوری کرو اور جان چھڑاؤ ہمای اس بلا سے۔“

”ٹھیک ہے آپ پریشان نہ ہوں میں کرتی ہوں کچھ۔“

دو کروڑ اس کے اکاؤنٹ میں آ گئے تھے اب تو کچھ کرنا ہی تھا اسے، پورے دو گھنٹوں میں اس نے پلان بنایا کہ جن جن جگہوں پر شہریار کی بیوی جاتی ہے پہلے وہ وہاں وہاں اس کے اوقات کار کا پتہ لگائے گی اور پھر شہریار کی بیٹی کو مہرہ بتا کر وہ محراب کے کندھے پر بندوق رکھتے ہوئے ہن کا نشانہ لے لے گی، بظاہر یہ سب سوچنا آسان لگتا تھا مگر حقیقت اس سے مختلف تھی۔

اسے اس معاملے میں بے حد محتاط رہنا تھا۔ آخر کار کسی کی حیاں لینا کوئی آسان کام تھوڑی تھا۔

☆.....☆.....☆

اس رات حباب سے واپسی پر وہ زارون کے پہلو میں آ کر بیٹھی تو پہلی بار بستر پر اس کی موجودگی سے تحفظ کا احساس ہوا۔ کوئی تھا دنیا میں جسے اس کا تماشا بننا برا لگتا تھا۔ وہ جاگ رہا تھا محراب اس سے بنا کوئی بات کیے چپ چاپ اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔ تب ہی وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”کیسا رہا آج کا دن؟“ محراب کو اس سے قطعی امید نہیں تھی کہ وہ ایسا کوئی سوال کرے گا تب ہی حیرانی سے پلٹ کر اسے دیکھا جس کی اداس نگاہیں اس کے وجود پر تکی

30

نہیں سیکھاتم نے اپنی اس غلطی سے۔" وہ صبح کھڑا تھا۔

محراب کی ہمت ہی نہ ہوئی وہ ہراٹھا سکے۔

"دنیا تمہارے جیسی نہیں ہے محراب، تم ایک شفاف

موتی ہو مگر یہ معاشرہ کچڑ ہے، اسی لیے میں تمہیں خود سے

بھی چھپا کر رکھنا چاہتا ہوں، تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ تم

کتنی معصوم اور بے وقوف ہو، مجھے تو اس جاب میں بھی

اس کا کوئی مفاد نظر آ رہا ہے ورنہ آج کل پچیس تیس ہزار

کی نوکری کے لیے لوگوں کی جوتیاں گھس جاتی ہیں اور اس

نے تمہیں بلک جھکنے میں چالیس ہزار کی نوکری دلوادی،

واہ کمال ہو گیا۔" وہ تلخ ہو رہا تھا۔ محراب نے دلوں

ہاتھوں کی ہتھیلیاں آپس میں رگڑیں۔

"وہ لکسی نہیں ہے، تم اس کے بارے میں غلط گمان

کر رہے ہو، وہ بس میری مدد کرنا چاہتی ہے اور کچھ نہیں۔"

"بچہ اللہ کرے ایسا ہی ہو، صبح کورٹ جانا ہے مجھے،

جب اشو تو مجھے بھی ساتھ ہی اٹھا دینا۔"

"کورٹ کیوں جانا ہے؟" اب کے اس نے چونک

کر دیکھا۔ زارون نے سگریٹ سلگایا۔

"پیشی ہے، غزالہ نے کیس کیا ہے مجھ پر مان تھک

کا۔"

"مان تھک تو اس کا اور بچے کا حق ہے۔"

"ہاں اگر بچہ اپنا ہو اور بیوی کوئی تمہاری جیسی اللہ

میاں کی گائے ہو تو۔"

"کیا مطلب؟ تم کہنا چاہتے ہو کہ بچہ تمہارا نہیں

ہے؟"

"ہاں۔"

"مگر تم ایسا کیسے کہہ سکتے ہو جبکہ تمہارا اس کے ساتھ

میاں بیوی والا تعلق تھا۔"

"جو کچھ بھی تھا تم سے نکاح سے پہلے تھا، تمہیں اپنا

بنانے کے بعد اس سے کوئی تعلق نہیں رکھا میں نے اور یہ

بات وہ جانتی ہے اس لیے بدلہ لے رہی ہے۔"

"پہلے کا بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"نہیں اس سے ملاقات کے آخری دن تک ایسا کوئی

ہوئی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"بہت مشکل، مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ مجھے یہ

جاب صرف ایک چھوٹی سی شیطان بچی کو سنبھالنے کے

لیے مل رہی ہے، کیا کیا نہیں پکویا اس نے مجھ سے مگر کھایا

کچھ بھی نہیں، میرا بس نہیں چل رہا تھا اس کا گلہ گھونٹ

دیتی۔" پہلی بار وہ اس سے کچھ شیر کر رہی تھی۔ زارون کو

اچھا لگا۔

"ماں کہاں تھی اس کی؟"

"ماں نہیں ہے، چھوڑ کر جا چکی ہے، ایسی شیطان

اولاد کو پالنا کوئی آسان کام ہی ہے۔"

"ہوں اپنی دوست کو بتایا تم نے۔"

"بتایا ہے مگر اس کا ایک ہی جواب ہے ہمت سے کام

لو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اس نے یہ جاب دلوائی ہے ناں۔"

"ہوں۔"

"کب سے جانتی ہو تم اس لڑکی کو؟"

"جب سے اس گھر میں آئی ہوں۔"

"کون کون ہے اس کے گھر میں؟"

"پتا نہیں، میں نے بھی پوچھا نہیں۔"

"کرتی کیا ہے؟"

"نہیں پتا۔"

"تو پتا کیا ہے؟ وہ تمہارے سارے معاملات میں

شامل ہے اور تمہیں اس سے متعلق کچھ پتا ہی نہیں، شاباش

ہے تمہیں۔" وہ خفا ہوا۔ محراب کو بھی محسوس ہو گیا کہ اس کی

غلطی ہے تب ہی سر جھکاتے ہوئے بولی۔

"اب ملوں گی تو سب کچھ پوچھ لوں گی، لڑکی بری

نہیں ہے۔"

"کسی کے ماتھے پر نہیں لکھا ہوتا کہ وہ کیسا ہے، یہ

وقت بتاتا ہے، دیکھا نہیں تم نے کتنا اعتبار کرتی تھیں تم

غزالہ پر مگر کیا صلاح، ساری عمر کے لیے مجھ جیسا ابک

نا پسند خلع تمہارے گلے پڑ گیا جو بدنامی ہوئی وہ الگ

اور قطعی بے قصور ہوتے ہوئے جو سزا ملی وہ الگ، جب

اس رات زارون نے زیر دستی اسے اپنے ہاؤس پر لایا تھا۔ اسے تو سکون کی نیند آگئی مگر محراب ساری رات بھر سوئی تھی۔

معاذ نہیں تھا۔
”تو پھر اب کیا کرو گے تم؟“
”کچھ نہیں، اسے اسی کے کھوے ہوئے گڑھے میں منہ کے بل گراؤں گا۔“
”کیسے؟“

انگل صبح زارون محراب کے اٹھانے سے پہلے اٹھ گیا تھا۔ وہ جب نماز فجر کے بعد سوئی تھی اب تاخیر سے اٹھنے پر خاصی شرمندہ تھی۔ چپ چاپ بستر سے اٹھ کر واش روم میں گھر گئی، اچھی طرح فریش ہو کر باہر آئی تو زارون اسی کا منتظر تھا۔

”عدالت میں پیش ہو کر۔“
”چلو اللہ کامیاب کرے، طلاق نہیں دو گے؟“ کن اکیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”دوں گا مگر اچھی طرح ناک سے لیکر سر نکلا کر۔“
محراب نے اس کے اس جملے کو بھی اپنی سمجھ اور شک کے مطابق لیا۔ اس کی نظر میں وہ کسی صورت غزالہ سے دستبردار ہونے کو تیار ہی نہیں تھا۔

”چچی نے ناشتہ بنالیا ہے، تم ایسا کرو میری کپڑے نکال دو، تھوڑا پانی دے دو منہ ہاتھ دھو لوں پھر کپڑے بدل دیتا۔“

”جہاں غزالہ سے علیحدگی کی بات آتی تھی وہ پہلو بچا لیتا تھا۔ اعدا کہیں چور ہو گا ایسے ہی اس کے لیے بہن نہیں مروائی میری۔“ جل کر سوچتے ہوئے اس نے پھر گروٹ بدل لی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ دوپٹے سے گیلیا چہرہ خشک کرتی وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وارڈ روب کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اپنی پسند سے اس نے زارون کے لیے کاشن کا نیلا سوٹ نکالا مگر اس نے ریجیکٹ کر دیا۔

ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ اسے اپنی کمر پر زارون کا ہاتھ رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ محراب کا سارا جسم برف بن گیا۔

”نہیں یہ رکھ دو، وہ والا بلیک سوٹ جو نظر آ رہا ہے وہ لاؤ۔“ اپورنڈ کپڑے والا بلیک سوٹ وہ تین ماہ قبل دکان سے لایا تھا اور شہر کے سب سے مہنگے ٹیلر سے فل فیشن میں سلوایا تھا۔ اس وقت اس لباس کے لیے اس کی پسند نے محراب کو جیسے گنگنا دیا۔

”کھانا کھا لیا تم نے؟“ اس نے پوچھا۔
”ہاں اور تم نے؟“ بمشکل وہ جواب دے پائی تھی جب دو بوللا۔
”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”حد ہو گئی ہے، اس عزت نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے تمہیں مگر تمہارے دل میں اب بھی اس کی محبت کے چشمے اٹل رہے ہیں، وہ بلاوجہ عدالت میں گھسیٹ رہی ہے تمہیں اور تم تیار ہو کر اب بھی اسے دکھانے کے لیے اسٹینڈر بن ٹھن کے جا رہے ہو جیسے پٹنی نہ ہوئی برأت ہو گئی۔“ بلیک سوٹ الماری سے نکالتے ہوئے وہ بڑبڑائی تو زارون مسکرایا۔

”کیوں پچھلے دو دن سے تم نے کچھ نہیں کھایا، اس دن ڈاکٹر فرحت کتنا غصہ کر رہے تھے یاد ہے ہاں تمہیں، جلدی ٹھیک ہونے کے لیے وقت پر کھانا بھی ضروری ہے۔“ نصیحت بھرے لہجے میں کہتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
جب زارون نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”تمہیں کوئی مسئلہ ہے؟“
”مجھے کوئی مسئلہ کیوں ہونے لگا، میری بلا سے جان

”اب ہاتھ کا زخم کیسا ہے تمہارا؟“
”بہتر ہے، میں کھانا لاتی ہوں تم کھاؤ۔“ فوراً ہی اس نے ہاتھ چھڑا لیا تھا۔

”تم چل رہی ہو ساتھ؟“ زارون نے مزید لطف لیا

”اتنا تم نہیں ہے میرے پاس۔“ اس کے مسکرا کر دیکھنے پر وہ پھر جلی، زارون کا اس کا یہ روپ بے حد اچھا لگا۔

تیار ہو کر اس نے اپنے دوست کو کال کر دی تھی۔ وہ گاڑی لے آیا تو محراب نے پوچھا۔
”باہر کیسے جاؤ گے وہیل چیئر تو ہے نہیں۔“
”تم تو ہونا، لے جاؤ اٹھا کر۔“ وہ کہاں باز آنے والا تھا، محراب گھور کر رہ گئی۔

”دوسن وزن ہے تمہارا، میری اتنی جان نہیں کہ تمہیں اٹھا سکوں۔“

”تو بتا لو جان، کس نے روکا ہے۔“
”تمہیں دیر نہیں ہو رہی اب؟“ کرا سینٹے ہوئے اس نے طنز کیا تو وہ مسکرا دیا۔

”دیر تو ہو رہی ہے مگر تم نے جان بوجھ کر باتوں میں لگایا ہوا ہے، تم جانے دو گی تو جاؤں گا ناں؟“

”جاؤ..... میری طرف سے اجازت ہے۔“
”نئے غصے سے کیوں کہہ رہی ہو، لگتا ہے صبح مرچیں جیالی ہیں۔“

”نے نہیں جانا، میرا خیال ہے میں ہی چلی جاتی ہوں یہاں سے۔“ وہ درج ہو گئی تھی۔ زارون کھلکھلا کر ہنس دیا۔

محراب کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے دوست کو کال کی، وہ گاڑی سے وہیل چیئر لے آیا تھا۔ بیڈ سے کرسی پر اسی نے اسے منتقل کیا پھر وہی اسے لے کر باہر گیا۔

محراب نے کچن کی کھڑکی سے اسے جاتے دیکھا پھر بڑبڑائی۔

”گھنا، مینا، چلاک کہیں کا۔“
(آخری قسط ان شاء اللہ گلے ماہ)



جب وہ تنگ کر بولی۔

”نہیں، اتنا فالو وقت نہیں ہے میرے پاس۔“
”چلو ٹھیک ہے پھر بدل دو کپڑے، دیر ہو رہی ہے۔“

”سبحان اللہ، ابھی تو نہیں بجے اور تمہیں دیر ہو رہی ہے، بڑی بے تابی ہے پر کئی منکوحہ سے ملنے کی۔“ اب کے سنگ کر کہتے ہوئے اس نے کپڑے بیڈ پر پٹخ دیئے تھے۔

”میرا تو خیال ہے ساری رات خیندی نہیں آئی ہوگی تمہیں عدالت جانے کا سوچ کر۔“

”عدالت تو بجے کھل جاتی ہے اور مجھے وہاں تک پہنچنے کے لیے ابھی ڈیڑھ گھنٹے کا سفر طے کرنا ہے۔“

”ہاں ہاں، جاؤ جاؤ۔ کس نے روکا ہے میں تو کہتی ہو ناشتہ بھی وہیں اسی دھوکے باز کے ساتھ کر لینا کیا پتا کیس واپس لے لے لے لے۔“

”تم دعا کرو کیس واپس لے لے وہ کیونکہ طلاق اسے میں نہیں دوں گا، کبھی بھی نہیں۔“

”تو نہ دو، مجھے کیوں سنا رہے ہو؟“ اس بار لہجہ پہلے سے زیادہ جلالی تھا۔ زارون نے مسکراہٹ چھپالی۔

”تمہاری دعائیں بہت قبول ہوتی ہیں اس لیے۔“
”ہاں بہت قبول ہوتی ہیں، قبول ہوتیں تو آج تمہارے ساتھ نصیب پھوٹ نہ رہے ہوتے میرے؟“

اعد کہیں آگ لگی تھی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔
شرٹ اتارتے ہوئے زارون نے جان بوجھ کر اسے تنگ کیا۔

”کیا مسئلہ ہے، پہننے ہیں کپڑے تو پہن لو، نہیں تو مجھے اور بھی بہت کام ہیں۔“ وہ غصے ہوئی۔

زارون نے مزید تنگ کرنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ ناشتہ کر رہا تھا جب محراب نے پوچھا۔

”واپس کب تک ہوگی تمہاری؟“
”کوئی پتا نہیں، شام ہو جائے گی، کیوں مس کرو گی تم مجھے؟“

آخری حصہ

دھشتی

نازیہ کنول نازی

digest novels lovers group ❤️❤️

سردیوں کا موسم ہے بریں بوائیں ہیں

سال نو آچکا، جنوری کی شامیں ہیں

اداسیوں میں لیے ہوئے ماہ و سال گزرے ہیں

چلے آؤ کہ صدیوں سے ترسی ہوئی نگاہیں ہیں

ہمیں ماتھے پر بوسہ

کہ ہم کو تلیوں کے جگنوؤں کے شہر جانا ہے

عصرِ دھل چکی گی

مغرب کا وقت بھی تنگ پڑ رہا تھا مگر زامروں کی واہسی

کا ابھی تک کوئی نام نہ نہان نہیں تھا۔

مخرب کام سے واپس آئی تو بے ساختہ پریشان

ہو گئی۔ وہ جونج بڑے دعوے سے کہہ رہی تھی کہ اس کے

پاس اسے کس کرنے کے لیے وقت نہیں ہے اب دن

دھل جانے پر بے ساختہ فکر مند ہونے لگی گی۔ مضطرب

نگاہیں بار بار بجنگ کر وال کھاک کی جانب اٹھ رہی تھیں

اور دل کی حالت ایسی تھی کہ جیسے غروب ہونے سورج کے

ساتھ وہ بھی ڈوب رہا ہو۔

”زامروں کو اتنی دیر نہیں گنی چاہیے تھی۔“ مریم بیگم اس

کی بے چینی اور ٹکڑ ٹکڑ کر رہی تھیں مگر خاموش تھیں۔

مغرب سے عشاء ہو گئی مگر زامروں نہیں آیا۔ اسے غصا آنے

لگا۔ ذہن میں سو طرح کے خدشات سر اٹھا رہے تھے۔

بوجھل دل اور سگتے اعصاب کے ساتھ اس نے رات کا

کھانا تیار کیا تھا۔

کبھی ہم خوب صورت تھے

کتابوں میں ایسی خوشبو کی مانند سانس ساکن تھی

بہت سے ان کے کہے لفظوں سے تصویریں بناتے تھے

پرندوں کے پردوں پر لکھ کر

دور کی جہیلاں میں اسے والے لوگوں کو

سناتے تھے

جو ہم سے دور کرتے تھے

ہمارے پاس رہتے تھے

نئے دن کی مسافت جب

کرن کے ساتھ آگن میں اترتی تھی

تو ہم کہتے تھے ای تلیوں کے پر

بہت ہی خوب صورت ہیں

ہمیں ماتھے پر بوسہ

کہ ہم کو تلیوں کے جگنوؤں کے دیس جانا ہے

ہمیں رنگوں کے جگنو

روشنی کی تلیاں آواز دیتی ہیں

نئے دن کی مسافت دنگ میں ڈوبی ہوا کے ساتھ

کمر کی سے بلاتی ہے

رات کے کسی بنگارے تھے جب گیٹ کے پرکازی
رکنے کی آواز آئی۔ محراب کا الجھا سانس بے ساختہ بحال
ہوا تھا۔

مریم بیگم سوچتی تھیں لہذا گیٹ اسی نے کھولا۔
زارون کا دوست اسے ڈیکل جیٹر کے ساتھ گیٹ تک چھوڑ
گیا تھا۔ محراب نے دیکھا وہ بے حد تھکا ہوا تھوڑا حال سالک
رہا تھا مگر اس نے پروا نہیں کی۔ اندر کوئی آواز تھا جو پھٹنے کے
لیے تیار تھا۔

”آگیا تمہیں کمریاد؟ حد ہوتی ہے لا پرواہی کی۔“
زارون نے اس کے غصے پر قدمے حیرانی سے اس کی
طرف دیکھا۔

”مجھے کہہ دی ہوتی۔“
”تمہیں تمہارے فرشتوں کو کہہ دی ہوں۔“ اس کا بس
نہ چل رہا تھا کہ اسے کچا چاہائی۔ زارون کو اس کا لہجہ بے
حد گور گور کر رہا تھا۔ وہ بدداشت کر گیا۔

”آوارہ گردی کرنے نہیں کیا تھا، کام سے گیا تھا، کام

ختم کر کے ہی آنا تھا، معذور انسان ہوں، اپنے اختیار کا
مالک نہیں رہا ہوں۔“

”اتنا وقت لگتا ہے کام ختم کر کے؟ میں؟ کون سی
عدالت ہے جو اس وقت تک کھلی رہتی ہے پانچ استے سی
کارڈنگ تھے کہ سارا دن بس تمہارا ہی کیس بننا ہے۔“ وہ
اتنی آؤٹ آف کنٹرول کیوں ہو رہی تھی اسے خود بھی خبر
نہیں تھی۔ زارون لب بکھینچ کر رہ گیا۔

”تمہیں کیا مسئلہ ہے میری وجہ سے اگر تمہارا کوئی
کام رکا ہوا ہے تو بتاؤ۔“ برداشت کے باوجود اس کا لہجہ
فضیلا ہوا تو وہ غل کر رہ گئی۔

”بھاڑ میں جاؤ میری بلا سے۔“ پاؤں بلیغ کر کہتے
ہوئے وہ واپس پلٹ گئی۔ زارون سر ہلکا ہلکا کر رہ گیا تھا۔

اپنے کمرے میں محراب دونوں پاؤں سمیٹ کر بیڈ پر
بیٹھی تھی۔ کب سے رکے فسوس کو جیسے پہنے کا موقع مل
گیا تھا۔

”سب ٹھیک تو ہے چٹا۔“ محراب کے وہاں سے



ملے جانے پر اس نے پاس کھڑی مریم بیگم سے پوچھا جو کچھ دیر قبل ہی محراب کی بلند آواز پر جاگ کر باہر آئی تھیں۔ تب ہی وہ بولیں۔

”پریشان ہو رہی تھی تمہارے لیے، جیلوں، عدالتوں کے کاموں میں بندہ پریشان ہو ہی جاتا ہے۔“

”ہوں۔۔۔“ ان کی وضاحت پر آہستہ سے اثبات میں سر ہلا کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

ڈپل چیئر کے پیسے جو نئی دہلیز تک پہنچے اندر وہ بیل پر روتی ہوئی اسے مزید حیران کر گئی۔ دن بھر کی تھکن کئی گنا مزید بڑھ گئی تھی۔

”ہوا کیا ہے، میں صبح جمہیں بتا کر گیا تھا کہ مٹی ہے سو ہائل تمہارے سامنے میں نے کل غصے میں توڑ دیا تھا، کیسے رابطہ کرتا، رونے والی کون سی بات ہے اس میں؟“

”کوئی بات نہیں، اپنے کام سے کام نہ کھولیں۔“ تروخ کر کہتے ہوئے وہ بندہ سے اٹھی۔

اس وقت وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے کون سی چیز رلا رہی ہے۔ کس وجہ سے اتنا غصا رہا ہے۔ اٹھ کھین بس ایک ہی بات سرخ رہی تھی کہ ضرور اس نے غزال کے ساتھ وقت گزارا ہوگا، اس کی منت کی ہوگی کہ وہ کیس واپس لے کر صلح کر لے، اور بس یہی بات اسے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

زامون حیران پریشان سا اس کا بھگکا ہوا چہرہ دیکھتا رہا۔ اس رات وہ کمرے میں بھی نہیں سولی تھی۔ زامون کو کھانا اور چائے مریم بیگم نے ہی دیا۔ اگلے روز اس کے جانے سے پہلے ہی وہ کام پر چلی گئی تھی۔

زامون کا سر بے حد بھاری ہودھا تھا۔ کل رات بہت دیر تک جاگ کر وہ بے قرار سا اس کا انتظار کرتا رہا تھا صبح فجر کے قریب کبھی آنکھ لگی تھی، ساری

رات سوچ سوچ کر بھی اسے کبھی اپنی غلطی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ذہن میں اگر کوئی سوچ جگ بھاری تھی تو وہ یہی تھی کہ محراب اس سے بیزار ہو رہی ہے۔ تھک رہی ہے اس کی

دستاری ہے اور اب کسی بہانے سے غزال کی طرح وہ بھی

اس سے جان چھڑانا چاہ رہی ہے۔ اذیت ہی اذیت تھی۔ پہلی بار اسے اپنی معذوری اور بے بسی پر رونا آیا تھا۔ سارا دن وہ بے قرار سا بھوکا پیاسا اس کا انتظار کرتا رہا، شام کو وہ گھر واپس آئی تو اسے سکون ملا۔

”محراب۔“ وہ کھانا کھا رہی تھی جب اس نے آواز دے کر بلایا۔ کھانے سے ہاتھ روک کر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کمرے میں آ گئی تھی۔

”ہوں۔“

”ایک گلاس پانی پلاؤ۔“

”پاس جگ رکھا ہوا ہے بھر کر خود پی سکتے ہو تم۔“ وہ ابھی تک غصے میں تھی۔ زامون مسکرا دیا۔

”پی تو سکتا ہوں مگر تمہارے ہاتھ سے پینا اچھا لگتا ہے۔“

”صاف کیوں نہیں کہتے کہ مفت کی ملازمہ سمجھا ہوا ہے مجھے، ایک وہ بیوی ہے جو جان چھڑانے کے لیے عدالتوں میں قصینتی پھر رہی ہے مگر پھر بھی موصوف تر لے کرتے پھرتے ہیں اس کے اور ایک میں بیوی ہوں جس کی زندگی کا سوائے خدمتوں کے اور کوئی مقصد ہی نہیں۔“

غصے سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے پانی جگ سے گلاس میں انڈیل دیا تھا۔ زامون نے آنکھیں موند کر سر پیچھے ٹکا دیا۔

”کون سی خدمت کرتی ہو تم میری، سارے دن تو لڑتی رہتی ہو، ابھی کل رات ہی دیکھ لو، زامون جو تمہیں احساس ہوا، وہ کبھی میرا شوہر سارے دن کی خواری کے بعد گھرا آیا ہے اسے پانی کا ایک گلاس ہی دے دوں الٹا آتے ہی جھگڑا شروع کر دیا تم نے۔“

”ہاں تو جس کے ساتھ پورا دن گزار کرائے تھے اس کے ساتھ کھانی کر بھی آتا تھا۔“

”کیسے تاکھا پی کر، وہ تو جان چھڑانے کے چکروں میں ہے۔“

”تو چھوڑ دو جان کیوں اپنی لور اس کی زندگی مشکل کی ہوئی ہے، مردانگی کہیں گئی تمہاری، تم تو بڑے غیرت

کی زندگی کی مشکلات کے بارے میں سوچتا، جو شے اس کے کام سے جڑے تھے وہ بھی بیزار ہو رہے تھے۔ دوستوں نے اپنا روپ دکھا دیا، رشتوں نے اپنا، اسے کبھی بھی خود پر ایسی آتی اور کبھی تنہا بیٹھا بیٹھا رو دیتا۔ سردار عبدالرحیم کی یاد آتی تو اپنے آپ سے نفرت سی محسوس ہونے لگتی۔ زندگی اس کے ساتھ جو سفاکی برت رہی تھی شاید وہ اسی کا مستحق تھا۔

عمر اب آج کل عجیب پریشان اور ابھری ہوئی سی رہتی۔ ایک تو جاب بے حد ستا دینے والی تھی لو پر سے زامون کی غزالہ کے لیے محبت نے اسے سلگا رکھا تھا۔ وہ لڑکی اگر اس کی سوتیلہ نہ بھی ہوتی تب بھی دنیا میں اس کے لیے سب سے زیادہ ناپسندیدہ تھی۔ اس وقت بھی وہ ان ہی سوچوں میں گم پیاز کاٹ رہی تھی جب شہر بار اپنی بیٹی کو بازوؤں میں اٹھائے وہاں چلا آیا۔

"ہاں بھئی۔۔۔ کیا مسئلہ ہے تمہیں، کیوں میری بیٹی کو تنگ کر رہی ہو؟" وہ کچن کے دروازے میں کھڑا تھا۔ عمر اب نے فوراً آواز پر پلٹ کر دیکھا اور شہر بار جیسے ٹھٹھک گیا۔

"تم۔۔۔؟" اسے وہ لڑکی اب تک بھولی نہیں تھی۔ عمر اب کا سر جھک گیا۔

"جی۔۔۔" "دیر گزشتہ۔۔۔ اس روز آسمانی بجلی نی ہوئی تھی اور آج" "جی" کیا بات ہے؟" اس نے طنز کیا۔ عمر اب کو برداشت کرنا پڑا۔

"کیا پکا رہی ہو کھانے میں؟" فوراً ہی اس نے موضوع بدلا تھا۔ عمر اب نے شکر کا کلمہ پڑھا۔ "کچھ نہیں، ابھی تو پیاز کاٹ رہی ہوں جو آپ کہیں گے پکا دوں گی۔"

"ٹھیک ہے گڑیا کے لیے ابھی فوراً نوڈلز بنا دو کچپ کے ساتھ، شام میں میرے کچھ دوست آرہے ہیں ان کے لیے ذرا اچھا سا منقہ فروٹ چاٹ، چٹنی کباب اور کھیر وغیرہ تیار کرو۔" یہ باتیں ہیں تو اسی حساب سے سوچیں

والے بنتے تھے۔" "نفرت والا تو اب بھی ہوں مگر بس بیویوں کے معاملے میں بہت بے بس ہو گیا ہوں۔"

"بیویوں کے معاملے میں نہیں، صرف اسی ایک چیز کے معاملے میں بے بس ہو تم۔ مجھے سمجھ نہیں آتی جب وہ اتنی ہی دل پر چڑھی ہوئی تھی تو میری بہن کو بے موت مار کر مجھ سے نکاح کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ رچے اسی کے ساتھ خوش۔" لفظوں میں چنگاریاں اب بھی ہانی تھیں۔ زامون اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"تم نے کہاں دل پر چڑھے ہوئے دیکھ لیا ہے۔" "امم جی نہیں ہوں میں، سب نظر آتا ہے مجھے، ایویں صبح سدا تک دھکے نہیں کھا کر آئے کل۔"

"تار گاڑ سیک، پار، بیوی ہے وہ میری، نکاح کیا ہے اس کے ساتھ، اب اگر اس رشتے کو بچانا چاہتا ہوں تو کیا لفظ ہے؟"

"کچھ لفظ نہیں ہے، تم لفظ ہو میری زندگی میں، اسے کہو یہاں آ کر خاطر داری کرے تمہاری، مجھ سے اب مزید کسی خدمت کی امید مت رکھنا۔" وہ چڑ کر بولی۔ زامون اسے گہری نگاہ سے دیکھ کر رہ گیا۔

وہ جیسے کمرے میں آئی تھی ویسے ہی واپس چلی گئی۔ اس کا رویہ زامون کی سمجھ سے باہر تھا۔ حالات نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا وہ کہاں کہاں پہنچا لگا تا۔ لال حویلی میں حالات بدل گئے تھے۔

سردار عبداللطیف نے اپنے اکلوتے بیٹے کی معذوری اور علاقے کے سرداروں کی ناراضگی کی وجہ سے لال حویلی چھوڑ کر ملک سے باہر ہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ زامون کے بڑے دونوں بھائیوں میں آج کل "گدنی" کے لیے جھگڑا چل رہا تھا۔

نیکم عبدالرحیم زامون کو یاد کر کے روتی رہتی تھیں مگر وہاں کسی کے پاس ان کے آنسو پونچھنے کا وقت نہیں تھا۔

نایاب عبدالکریم کی ناحق موت نے حویلی کی رونقیں نکل لی تھیں۔ پیرسٹم کو ان تھا جو زامون عبدالکریم اور اس

کھانا کھاتے ہیں سمجھ گئی؟

پریشان اور ہی ہوں گی اور میرا شو ہر بھی۔

تمی۔

ہوں۔۔۔۔۔ پانچ منٹ انتظار کرلو، میں کپڑے بدل لوں پھر تمہیں ڈراپ کروں گا۔ اس وقت تمہارا اکیلا جانا مجھے گوارا نہیں۔

گڈ۔ گہری نگاہوں سے محراب کا جھکا ہوا سر دیکھتے ہوئے اگلے ہی لمحے دوپٹ گیا۔ محراب نے شکر کا کلمہ پڑھا۔

”نہیں میں چلی جاؤں گی۔“

نی الوقت اس شخص کے سامنے کھڑے رہنا اس کے لیے دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔ گڑیا کے لیے نوڈلز بناتے ہی اس نے رات کے کھانے کے لیے تیاری شروع کر دی تھی۔ مریم بیگم کو بخار تھا لہذا اسے شام میں جلدی گھر جا کر رات کے لیے کھانا پکانا تھا۔

”روک نہیں رہا تمہیں صرف بتا رہا ہوں، اکیلے نہیں بھیج سکتا اس وقت، میری ذمہ داری ہو تم خود چھوڑ کر آؤں گا، سمجھ گئی، اب جاؤ اور جا کر کچن میں جتنا بھی کھانا بچا ہے پیک کرلو، میں کپڑے بدل کر آتا ہوں ابھی۔“ بتا گئے وہ شخص اس کی مشکل سمجھ گیا تھا۔ محراب مزید بحث کے بغیر خاموشی سے واپس آ گئی۔

بچھلے کچھ دنوں سے آئروے دکانی نہیں دی تھی جانے کہاں چلی گئی تھی؟

کچن میں سدا ہی کھانا تھوڑا تھوڑا بچا ہوا مل گیا لہذا اس نے سب پیک کر لیا اگلے تقریباً چند منٹ کے بعد شہریا تیار ہو کر کمرے سے نکل آیا تھا۔

شہریار کے دوست عشاء کے بعد آئے تھے، محراب نے کھانا مغرب کے وقت ہی تیار کر لیا۔ اسے جلدی گھر جانا تھا مگر شہریار سے اجازت لیتے ہوئے ہنگامہ پار ہی گئی۔ روز وہ مغرب سے پہلے نکل جاتا تھا تو وہ بھی آرام سے کام بننا کر چلی آتی تھی مگر آج نہ وہ خود کہیں گیا تھا نہ اسے جانے کی اجازت دی تھی۔ رات کے دس بج رہے تھے جب اللہ اللہ کر کے شہریار کے دوست وہاں سے رخصت ہوئے تو وہ بھی چھٹی کرنے کے لیے اس سے اجازت طلب کرنے اس کے کمرے میں چلی آئی۔

”چلو۔“ وہ کچن سے نکل کر اسی کے انتظار میں کھڑی تھی پاس کے حکم پر فوراً آگے بڑھ گئی۔ گھر سے نکل کر پارکنگ سٹاک نے میں ہی وجود ظہور کر دیا تھا۔ شہریار نے فرنٹ ڈور کھولا تھا۔

شہریار اس وقت اپنی بیوی کو سلا کر، کپڑے تبدیل کر رہا تھا کیونکہ ابھی اسے اپنے ایک قریبی دوست کی سالگرہ کی تقریب میں جانا تھا۔

”آ جاؤ جلدی، مجھے ابھی ایک دوست کی تقریب میں پہنچنا ہے۔“ محراب اس کے برابر بیٹھنا نہیں چاہ رہی تھی مگر مجبوراً بیٹھنا پڑا۔

محراب اپنی پریشانی میں تھکا جھکا دیکھ کر چلی آئی تھی سامنے شہریار ڈرینگ کے سامنے کھڑا شرٹ اتار رہا تھا۔ محراب کے قدم ہلنے پر ہی فریج ہو گئے تھے۔ ڈرینگ کتے بچنے سے شیریاہ نے اسے دیکھ لیا تھا تب ہی شرٹ واپس پہن لی۔

”کہاں چلنا ہے؟“

”آ جاؤ۔“ شرٹ پہن کر وہ پلٹا۔ محراب سے نظر اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔

”ٹھیک ہے، گائیڈ کر دینا، میں ڈراپ کروں گا۔“

”وہ مگر رخصت لیتے آئی تھی تاہم زیادہ ہو گیا جہاں مشکل ہو رہا تھا۔“

”شکر۔“

”نام کیا ہے تمہارا؟“ گاڑی اشارت کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ محراب اپنے گود میں دھرے ہاتھوں پر نظر جمائے بیٹھی رہی۔

”محراب۔“

”واؤ۔۔۔ گڈ نیم شوہر کیا کرتا ہے؟“

معذور ہوں پھر اتنی تاخیر سے گھر واپس کیا معنی رکھتی ہے۔ اس کا قصہ جائز تھا تب ہی وہ دم پڑ گئی۔
 "جیسے تم کل مجبور تھے ویسے ہی میں آج مجبور ہو گئی تھی۔"

"تم بلا لے دی ہو مجھ سے؟"

"نہیں۔۔۔۔۔ حقیقت بیان کر رہی ہوں۔"

"حقیقت بیان نہیں کر رہی، تم مجھے میری معذوری کی وجہ سے ذلیل کر رہی ہو، عراب عبدالکریم گزرتے ایک ایک لمحے میں تم مجھے میری بے بسی کا احساس دلاتی ہو، کاش میں معذور نہ ہوتا تو دیکھتا کیسے تم اتنی رات گئے اکیلی گھر سے باہر رہتی ہو۔" زامون کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ عراب، مریم بیگم کو ان کے بستر میں سلا کر اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

"تجسبیں۔۔۔۔۔ کیا لگتا ہے میں کوئی آوارہ عورت ہوں جسے سیر سپاٹوں اور آوارہ گردی کے لیے رات دیر تک گھر سے باہر رہنا اچھا لگتا ہے؟ تمہارا نہ کسی مگر اپنی بیمار ماں کا خیال ایک ایک بل پریشان کرتا رہا ہے مجھے، تجسبیں کیا خبر سارا دن کلیو کے نسل کی طرح جلدی جلدی ڈھیر سارے کام بنائی رہی تاکہ جلدی گھر آسکوں مگر چھٹی نہیں ملی، تم اگر آج معذور نہ ہوتو اس میں میرا کوئی قصور نہیں، تمہاری اپنی ضد ماں اپنی انا اور غصے کا قصور ہے، میں نے تمہاری مرضی کے خلاف گھر سے قدم باہر نکالا مگر کیا کرتی کوئی اور راستہ نہیں تھا اگر میں بھی اس گھٹیا خزانہ جیسی ہوتی تو کب کی تجسبیں تمہارے حال پر چھوڑ کر کہیں نہ کہیں اکل جاتی یا پھر بچا کی بات مان کر لال حویلی کے کسی کونے میں بڑی رہتی، بچا کے لیے تجسبیں جان سے مارنا مشکل نہیں تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ میں سمجھتی ہوں جیسے میں تمہاری ذمہ داری ہوں ایسے ہی تم میری ذمہ داری ہو، تجسبیں پھر سے تمہارے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے مجھے چاہیے تھی ہی پریشانی کیوں نہ اٹھانی پڑے میں پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں۔" کالج جیسی شفاف آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہر راز کھول رہی تھیں۔ زامون کا سارا قصہ

"کچھ نہیں۔"

"کیوں نشئی ہے؟"

"نہیں۔۔۔۔۔ معذور ہے۔"

"اوہ۔۔۔۔۔ ایک معذور شخص سے شادی کیوں کی، تم تو ابھی غامضی خوب صورت، صحت مند لڑکی ہو؟" گاڑی اب پارکنگ سے نکل کر سڑک پر فرار نے بھر رہی تھی۔ عراب کی نظریں سڑک کے اطراف میں بھاگتے مناظر پر ٹہر گئیں۔

"شادی سے پہلے ٹھیک تھا شادی کے بعد ایک ایک سیڈنٹ میں معذور ہو گیا۔"

"اوہ۔۔۔۔۔ میرے ایک عزیز دوست کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا، چلو خیر۔" گاڑی مطلوبہ روڈ پر موڑتے ہوئے اس نے چپ سا دھلی تھی۔

عراب کا دل بھی زامون کے بارے میں موج موج کر مزید بے قرار ہونے لگا تھا۔ وہ یقیناً صبح سے بھوکا تھا، جیسی مریم بیگم کی حالت تھی انہوں نے کہاں ناشتہ بنا کر دیا ہوگا اسے۔ گاڑی اس کی بتائی ہوئی جگہ پر ایک جھکے سے رکی تو وہ بھی ہوش میں واپس آئی۔

"چلو میں گھر تک چھوڑتا ہوں۔"

"نہیں۔۔۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں ہے، وہ سامنے ہی گھر ہے میں چلی جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ میسٹ آف لک۔" اس بار اس نے اصرار نہیں کیا۔

عراب گاڑی سے نکل کر گھر کی طرف پلٹ گئی۔ شہر یا گاڑی سڑک پر روکے اس کے گھر میں داخل ہونے تک وہیں کھڑا رہا۔ مریم بیگم کی طبیعت اس کی توقع کے عین مطابق بے حد خراب تھی۔ بخار سے تپتے وجود کے ساتھ کپکپاتے ہوئے انہوں نے دروازہ کھولا تھا۔

اتھ لپٹے کمرے میں ساتھی آہٹ پر لگائے زامون عبدالرحیم کے سلگتے دل کو قدرے قرار ملا تھا۔ بے حد غصے میں ڈھیل چیر و حکیل وہ کمرے سے باہر آیا تھا۔

"تجسبیں پتا تھا میں اپنی طبیعت ٹھیک نہیں اور میں

سندر کے جھاگ کی صورت بہہ گیا تھا۔

وہ انھی اور کچن کی طرف بڑھ گئی زامون وہیں بیٹھا رہا۔ محراب نے چائے پانی ساتھ میں پلیٹ میں بسکٹ نکال کر مریم بیگم کو چائے پانی پھر بخار کی دوا دے کر سلا دیا۔ ان سے فارغ ہو کر جو کھانا ساتھ لائی گئی وہ گرم کیا اور کمرے میں لے آئی۔ زامون کی نظر ٹرے پر پڑی تو وہ پوچھے بغیر بندہ سکا۔

”یہ کھانا وہاں سے لائی ہو، بچا ہوا؟“ اس کے سوال پر محراب نے فوراً چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر اس کی نفسیات سمجھتے ہوئے نرمی سے بولی۔

”نہیں۔۔۔ یہ میرا کھانا ہے جو میں نے وہاں اپنے کھانے کے لیے پلیٹ میں نکالا تھا مگر اسی وقت ان کے مہمان آ گئے تو کام میں لگ کر کھانا کھانے کا وقت ہی نہیں ملا۔ بھوک لگی ہوئی تھی اس لیے ساتھ لے آئی، امی کو بخار ہے، میں اپنا کھانا لے آئی اب صرف تمہارے لیے اتنی رات کو مشقت کرتی اچھی لگوں گی تمہیں؟ نہیں ہاں اس لیے پلیز تم بھی یہی شیئر کر لو۔“ بروقت بہت اچھا بہانہ سوچا تھا۔ زامون اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے تم کھا لو۔“

”ٹھیک ہے پھر پہلے میں تمہیں کھانا پکا دیتی ہوں بعد میں خود کھا لوں گی۔“ وہ بلیک میل کر رہی تھی۔ زامون واؤ میں آ گیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے، یہی کھا لوں گا۔“ اسے پتا تھا وہ اسے کھائے بغیر نہیں کھائے کی حب ہی ہار مان گیا۔ محراب اپنی کامیابی پر مسکروئی۔

سنا ہے وہ اس ہے

اسے کہو

کبھی بھی تیرگی میں ڈوبنے لگے

کبھی بھی ٹوٹ کر گرے

کبھی بھی ہار کر گرے

تو میری نظم تمام کر گئے لکایا کرے

میری فکر سے کائنات کے فسوں کو کھوج لے
تو سوچ لے

کہ منظر دلوں کو کیا ہوا

کسی نے اس کے نام پہ نہاں مکاں پلٹ دیے
فلاسفہ کے ذہن میں بنے قدیم زبویوں کے نقش

نک

الٹ دیے

کسی نے ان انخاؤں میں

غلامی کبکشاؤں میں

مہیب داستانوں کے سورجوں پہ

اس کا نام ثبت کر دیا

کسی نے اس کے داستانوں میں سرخ پھول بھرو دیے

کسی نے اس کے نام کے

دے جانے کے

طاغیوں میں رکھ دیے

اب بھی وہ اس ہے

اسے کہو

کتاب بھی تیرگی میں ڈوبنے لگے

اب بھی ٹوٹ کر گرے

اب بھی ہار کر گرے

تو میری نظم تمام کر گئے لکایا کرے

اس رات مریم بیگم کی بیماری کی وجہ سے وہ ان کے

ساتھ ہی سوئی تھی۔ زامون نے تھوڑی دیر اس کا انتظار کیا

پھر سو گیا تھا۔

رات کے تین بجے کا وقت تھا جب تیز بارش شروع

ہو گئی تھی۔ محراب کی آنکھ بارش کی تیز آواز پر ہی کھلی تھی۔

جلدی سے اٹھ کر دوپٹہ کندھوں پر پھیلاتے ہوئے اس

نے صحن کا رخ کیا جہاں بارش کی تیز بوندوں کے ساتھ

چھوٹے چھوٹے لولے بھی زمین پر گر رہے تھے۔

بارش اس بار بہت دلوں کے بعد ہوئی تھی۔

محبت پر نصب اوے کے جنگل سے نہ صرف بوندیں

نیچے صحن کو بکھوڑی تھیں بلکہ لولے بھی کافی جمع ہو گئے

تھے وہ اہل کمرے کے دروازے سے فیک لگائے کھڑی
 دونوں بازو سینے پر باندھے بارش کی آہٹ اور خوشبو کو محسوس
 کر رہی تھی۔

مریم بیکم کا بھلا ترچہ کا تھا اور اب دواؤں کے زیر اثر وہ
 سکون سے سو رہی تھی۔ زامون کے کمرے کی لائٹ جل
 رہی تھی وہ پلٹ کر کمرے کی طرف آئی۔ بیڈ پر دو بتا کبل
 کے سمٹا ہوا سو رہا تھا۔ محراب پاس بیٹھ کر پہلی بار فرصت
 سے اسے دیکھنے لگی۔

بالشبہ وہ شخص خوب صورتی اور وجاہت کا فکار تھا۔
 سرفی مائل گوری رنگت پر کھڑی ناک اس کی دلکشی میں چار
 چاند لگا رہی تھی۔ صحت مند سیاہ گھنے بال جو اس وقت
 کشادہ پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے، بے حد سلی اور ملائم
 تھے۔

بند آنکھیں جب کھلتی تھیں اور محراب کے چہرے کا
 طواف کرتی تھی تو قیامت بہا کرتی تھیں۔ کالج سی جگر جگر
 کرتی لگا ہوں میں ہزاروں ان کی باتیں سر اٹھاتی تھیں۔
 وہ شخص اگر کبھی مغرور رہا تھا تو بالکل ٹھیک رہا تھا۔ کتنی حیرت
 کی بات تھی کہ اتنے شاندار شخص کو چھوڑنے کے لیے اس
 کی دوسری بیوی نے عدالت کا سہارا لیا تھا۔

زامون کے ایک ایک نقش کو آنکھوں سے چھوتے
 ہوئے اس نے پیشانی پر بکھرے اس کے بال سینے پھر
 تھوڑا سا سہارا لے کر اس کے بازو اور تانیں سیدھی کرتے
 ہوئے کبل اس کے اوپر ڈال دیا۔

اس کے وہیم وگرن میں بھی نہیں تھا کہ اس کی آنکھ
 کھل جائے گی۔ کبل اس کے پورا اچھی طرح سینٹ
 کر کے جیسے ہی وہ سیدھی ہوئی اس کی کلائی زامون کی
 گرفت میں آ گئی۔ محراب کا دل اس لمحے بے ساختہ زور
 سے دھڑکا تھا۔

کلائی زامون کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش میں
 وہ اپنی کالج کی کئی چھڑیوں کا نقصان کر رہی تھی۔

”زامون ہاتھ چھوڑو۔“ بنا اس کی کھلی آنکھوں میں
 دیکھے اس نے سختی سے کہا مگر زامون پر مطلق اثر نہ ہوا

بجائے اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے اس نے اسے بیڈ پر
 اپنے برابر میں گرا لیا۔

”یہ کوئی وقت ہے کمرے میں آ کر سونے کا۔“ خند
 سے بوجھل تنہا لہجہ میں اس نے تقریباً سرگوشی کی۔ محراب
 نے جواب میں کراٹ لے کر اسے کی کوشش کی مگر اس نے
 ناکام ہوا۔

”ٹھیک ہے محض وہیں محراب بھی تمہارا شوہر ہوں۔
 ہمارے مذہب میں شوہر کے جو حقوق ہیں تم ان سے بے
 خبر یا لاعلم تو نہیں ہو محراب۔“ وہ اب بھی اس پر فوس
 پھونک رہا تھا۔

محراب کو اپنی جان مشکل میں پھنسی محسوس ہونے
 لگی۔ تب ہی وہ قد رسدغ پھیرتے ہوئے بولی۔
 ”ہمارے مذہب میں صرف شوہر کے حقوق نہیں

ہیں بیوی کے بھی بہت حقوق ہیں۔“

”میں نے کب انکار کیا ہے۔“

”پورے بھی نہیں کیے تھے۔“

”تو اب بدلا لے رہی ہو؟“

”نہیں۔۔۔ خود کو اپنی حد میں رکھ رہی ہوں۔“

”خود کو رکھ سکتی ہو مجھے نہیں۔“ اس کی آنکھوں میں

خند تھی۔ محراب کو اس وقت تنگی بہت مستحکم پڑ رہی تھی۔ باہر

بارش دو گھنٹے مسلسل برسنے کے بعد رک گئی تھی۔

صبح ہونے میں کچھ ہی دیر تھی مگر نہ زامون سویا نہ اس

نے محراب کو سونے دیا۔ باہر ہونے والی موسلا دھار بارش

کی وجہ سے کمرے میں بھی اچھی خاصی خشک بڑھ گئی تھی۔

تب ہی وہ بولا۔

”مجھے کل پھر ضروری کام سے جانا ہے میرا دوجائے تو

پریشان مت ہونا۔“

”کہیں جانا ہے؟ یقیناً اس منحوس خزانہ کے گہری

جانا ہوگا، کتنا زلیل کرو گے خود کو اس کے سامنے۔“ خود ہی

سوال پوچھ کر جواب بھی اس نے خود سے ہی فرض کر لیا

تھا۔ زامون کے لیوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”تمہارا دماغ خزانہ سے ہٹ کر کچھ نہیں سوچتا کیا؟“

"تمہیں خزانہ سے ہٹ کر کیوں نہیں سو جھٹا؟" اس کی مسکراہٹ نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ زارون کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"کل جس کام سے جا رہا ہوں اس کا خزانہ سے کوئی تعلق نہیں۔"

"تو پھر؟"

"لمبی بات ہے کیا کرو گی جان کر؟"

"تم بتاؤ، کچھ نہ کچھ کر ہی لوں گی میں۔" بال سمیٹ کر وہ اس کے پیلو سے اٹھی۔ زارون نے بھی تکیہ سیٹ کر کے بینڈ کی پشت گاو سے ٹیک لگالی۔

"ایک کلاں فیلو ہے میرا، یونہی سٹی میں مجھ سے دوستی کا خواہش مند تھا مگر میں نے بھی خاص لفٹ نہیں کرائی اور آج اتنے ماہ کے بعد اسے جیسے ہی میرے ساتھ ہوئے حلوئے کا پتا چلا تو فوراً ملنے یہاں آ گیا، کل اسی لیے تم پر فہم کیا کہ چچی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور تم وقت پر نا آئی تھی، چائے تک نہیں پلا سکا اسے میں، جبکہ وہ مجھے ہائیوں اور دوستوں سے بڑھ کر کر رہا ہے میرے لیے۔"

"ہوں۔ کیا کر رہا ہے وہ؟" محراب کی دلچسپی بڑھی۔ جب وہ بولا۔

"مدد کر رہا ہے میری، باہر جانے اور علاج کروانے کے سلسلے میں، سارے اخراجات وہی اٹھائے گا، اللہ کے کرم سے جب میں ٹھیک ہو جاؤں گا تو اس کی فرم میں اس کے ساتھ کام کروں گا اور اس کی ایک ایک پائی کا قرض ادا کروں گا۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے، ایک طرح سے یہ تو اللہ نے یہی مدد کی ہے تمہاری۔"

"ہوں۔ اللہ اپنے کسی بندے کو اس کی ہمت اور برداشت سے زیادہ نہیں آزماتا۔"

"یقیناً ہے۔"

"اب تمہیں بھی جاب پر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"ٹھیک ہے مگر ایک ماہ تو ہمارا پڑے گا کیونکہ وہ کل

"خود کے پیسے لے چکی ہوں۔"

"کتنے دن ہیں ایک ماہ پورا ہونے میں؟"

"تیرہ یا چودہ دن۔"

"ہوں۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے مجھے جلدی جانا پڑے تم آنٹی کے ساتھ اکیلی کیسے رہو گی؟" اسے سب سے زیادہ یہی فکر تھی۔ وہ مسکرا دی۔

"جیسے تمہاری دوسری بیوی رہتی ہے۔"

"خود کو اس کے ساتھ کیپیئر مت کیا کرو، تم اس جیسی نہیں ہو۔"

"کیوں۔۔۔ اس میں ایسی کیا خاص بات ہے؟"

"خاص بات تو ہے وہ شوچیں ہے، تم سیپ کا سوتی ہو، وہ امیر باب کی بگڑی ہوئی اولاد ہے، تم معذور شوہر کا کل ٹائٹ ہو۔" محراب کے وہ ہم وطن میں بھی نہیں تھا کہ وہ یہ فرق نکالے گا۔ تب ہی بھونچکا سی وہ اس کا منہ دھستری رہ گئی تھی۔

"وہ شوچیں ہے پھر بھی اسے کھانا نہیں چاہئے تم؟"

"میں صرف محراب عبدالمکریم کو نہیں کھانا چاہتا بس۔"

سیدھے جواب اس شخص کو آتے ہی نہیں تھے۔ محراب کا سر جھک گیا۔ وہ شخص ایک پہیلی تھا، ایک ایسی پہیلی جسے حل کرنا کم از کم اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

دل بے خبر زرا حوصلہ
نہیں مستقل کوئی سلسلہ
کوئی ایسا گھر بھی ہے شہر میں
جہاں پر نہیں ہو مطمئن
کوئی ایسا دل بھی کہیں ہے
جسے خوف آدھ نہیں

یہ جو گرد باز زمان ہے
یا زل سے ہے کوئی اب نہیں
دل بے خبر زرا حوصلہ
نہیں مستقل کوئی مرحلہ

یہ جو خار ہیں تیرے پاؤں میں
یہ جو خم ہیں تیرے ہاتھ میں

یہ جو خم ہیں تیرے ہاتھ میں

یہ جو خواب پھرتے ہیں وہ بد
یہ جو بات ابھی ہے بات میں
یہ جو لوگ بیٹھے ہیں جا بجا
کسی ان بنے سے دیا میں
سب ہی ایک جیسے ہیں سرگرم
تم زندگی کے فشار میں
یہ سراب یونہی سدا ہے
اکی ریک ذرا حیات میں
یہ حیات ہے تیرے چاروں
تو جس صرف تیری ہی گھات میں
دل بے خبر ذرا حوصلہ
نہیں مستقل کوئی مرحلہ
تیرے سامنے وہ کتاب ہے
جو پھر گئی ہے دور دور
ہمیں اپنے حصے کے وقت میں
اے جو زمانہ ہے سبق سبق ہیں مہلاتیں ذرا مختلف
مگر ایک اصل سوال ہے
جو کچھ سکتا ہے زندگی
کسی نعت خوان کی مثل ہے
دل بے خبر ذرا حوصلہ
نہیں مستقل کوئی مرحلہ
کیا عجب کہ کل کو یقین بنے
یہ جو مضطرب سا خیال ہے
کسی روشنی میں ہو مطلب
کسی سرخوشی کا نصیب ہو
یہ جو شب نما ہی بدلی
یہ جو صدمہ سا طالع ہے
دل بے خبر ذرا حوصلہ۔۔۔

اس روز آؤ وہاں آگئی تھی۔ واپس آتے ہی سب
سے پہلے اس نے محراب سے رابطہ کیا تھا۔ محراب جو اس
وقت وہاں کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی جب وہ
گنگلتے ہوئے بیرونی دروازے پر ہلکی سی دستک کے

بعد اندر چلی آئی۔
"اسلام علیکم کیسی ہو؟" کچن کے دروازے پر
کھڑے ہو کر اس نے اچانک کہا تو محراب چونگی پھر نظر
آؤ پر بڑی خوشگوار تھی۔
"وعلیکم السلام، الحمد للہ میں ٹھیک ہوں تم سناؤ کہاں
غائب ہو گئی تھیں؟"
"نہیں نہیں، ایک دوست کی شادی تھی اٹلی میں وہیں
گئی ہوئی تھی، جب کسی جا رہی ہے تمہاری؟"
"ٹھیک جا رہی ہے۔"

"چلو شکر ہے، شہریار بھائی کی بیٹی اب تو تنگ نہیں
کرتی؟"
"نہیں۔۔۔ اب تو قدرے مانوس ہو گئی ہے۔"
"اور شہریار بھائی؟" اچانک اس نے پوچھا اور وہ پھر
چونگی۔

"کیا مطلب؟"
"مطلب شہریار بھائی نے تو زیادہ پریشان نہیں
کیا؟"
"نہیں۔"

"گڈ۔۔۔ پھر تو خاصی کامیاب جا ب چل رہی
ہے۔" آؤ مسکرائی، محراب نے اپنی توجہ پھر سے سبزی پر
مبذول کر دی تھی۔

"کامیاب کا تو ہوتا نہیں مگر میں بس اسی ہفتے جاؤں گی
اس کے بعد جا ب چھوڑ دوں گی۔"

"کیوں؟" آؤ کے چہرے کا رنگ ایک منٹ میں
بدلا تھا۔ محراب سر جھکائے سبزی کا شددی۔

"بس زامون کو نہیں پسند وہ علاج کے لیے باہر جا رہا
ہے، اللہ نے چاہا تو جلد اپنے پاؤں پر کھڑا بھی ہو جائے گا
پھر مجھے جا ب کی کیا ضرورت؟"

"ایک منٹ۔۔۔ ایک منٹ زامون مطلب تمہارا
شوہر علاج کے لیے امروڈ جا رہا ہے یہی کہا ہے ناں تم
نے؟"

"ہی۔"

"تو اس کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے بقول تمہارے اس کے کاؤنٹ میں تو زیادہ پیسے نہیں تھے۔"

"ہاں کوئی دوست مدد کر رہا ہے، جیسے میری مدد تم نے کی۔"

"اوہ تو کب سے چھوڑ رہی ہو تم جاب؟"

"بس یہی جو بارہ تیرا دن ہیں ایک ماہ مکمل ہونے پر یہی مکمل کروں گی بس۔"

"تو ٹھیک ہے میں انکل سے بات کر لوں گی۔"

عمراب نے نوٹ کیا وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہی تھی اسے حیرانی ہوئی۔

"کیا ہوا۔ تمہیں اچھا نہیں لگا؟" اس کے سوال پر غائب و مافی سے وہ مسکرائی۔

"نہیں یاد مجھے کچھ بھی اچھا برا نہیں لگتا بات اصل میں بھائی انکل کی ہے۔ تمہیں جاب دیتے وقت انہوں نے سختی سے یہ ہدایت کی تھی کہ جب بھی تمہیں جاب چھوڑنی ہوگی تم ایک ڈیزجہ ماہ پہلے انہیں مطلع کر دو گی تاکہ وہ کسی نئی شیف کا انتظام کر سکیں پتا تو ہے تمہیں ان کی پوتی کا کتنی نخر چلی ہے وہ اب تناؤ میں نے اپنی سفارش پر تمہیں جاب دلائی اب میں کیا کہوں گی ان سے۔" وہ سچ کہہ رہی تھی۔

آزاد کی مسکراہٹ بھی سست گئی۔

"میرنی مجبوری ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے مگر ایک ماہ پہلے تمہاری سب سے بڑی مجبوری جاب تھی۔" وہ اب خفا لگ رہی تھی۔

عمراب کے ہاتھوں کی حرکت سست پڑ گئی۔

"اے مجبوری آزاد، مجھے نہیں پتا تھا کہ حالات ایسے بدل جائیں گے۔"

"اس ماہ کے سب چلتی ہوں، بائے۔"

"ارے بھو، میں چائے بنا رہی ہوں۔"

"نہیں۔۔۔ مجھے کام ہے پھر کسی۔" آف موڈ کے ساتھ ہی تیز تیز قدم اٹھائی وہ واپس چلی گئی، عمراب کا دل جیسے مر رہا کر رہ گیا تھا۔

کتنے احسان تھے اس لڑکی کے اس پر اس نے کیا

صلہ دیا یہی سوچ کر شرمندہ ہو رہی تھی۔ زامون کی آنکھوں میں دھڑوں کی گنگناہٹ سے ہی کھلی تھی۔ ستر سے ڈبل جیر پر فٹل ہو کر وہ کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

"کیا بات ہے، کوئی آیا تھا کیا؟"

"ہوں آزاد آئی تھی۔" سبزی دھو کر رکھتے ہوئے اس نے پلٹ کر زامون کے سوال کا جواب دیا۔ وہ کچن میں آ گیا تھا۔

"کیا کہہ رہی تھی؟"

"کیا کہتا ہے، جاب چھوڑنے والے ذکر پر فٹل کا اظہار کر رہی تھی۔"

"کیوں۔۔۔ اسے کیا مسئلہ ہے؟" زامون کو برا لگا۔

"اسے ہی تو مسئلہ ہے، اس کی سفارش پر ہی یہ جاب ملی تھی مجھے وہ بھی اس شرط پر کہ جب میں یہ جاب چھوڑ دوں گی تو ایک ماہ پہلے انہیں مطلع کروں گی تاکہ وہ نئی شیف کا بندوبست کر سکیں۔"

"دہری گند۔ بہت دلچسپ کہانی ہے یہ۔"

"چلو، کہانی کیسے ہوئی، اصول ہے یہ ان کے گھر کا۔"

"ہو گا مگر میرے لیے بہت اٹوکھا اصول ہے، جتنے بڑے گھر سے ان کا تعلق ہے بقول تمہارے انہیں ملے گی ہے ملازمین کی؟ پھر اتنی پرکشش میخانہ، وہ تو جاب نہ ہوئی کرائے کا مکان ہو گیا۔" اس کی بات میں وزن تھا، عمراب دیکھ کر رہ گئی۔

"تمہیں تو آزاد سے خواتین کی دشمنی ہوئی ہے، اس کی نیکی پر بھی شک کر رہے ہو، ایک تو اس نے مشکل وقت میں اپنی مدد کی ہماری بھڑکی تم۔"

"بس کرو، مجھے تو اس کی نیکی میں بھی اس کا کوئی مذاہ نظر آ رہا ہے۔"

"اللہ کا نام لو زامون، وہ ایسی نہیں ہے نہ مجھ سے کوئی لالچ ہے اسے، پڑھی لکھی امیر کیر لڑکی ہے اسے کس چیز کی کمی ہے بھلا۔"

"کی کا تو مجھے نہیں پتا مگر دنیا دیکھی ہے میں نے،

لوگوں کی تھوڑی بہت پہچان رکھتا ہوں۔ مجھے یہ لڑکی
تمہارے ساتھ مقصود نہیں تھی۔
”ایسا کچھ نہیں ہے۔“

”چلو اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ اس نے بحث سمیٹ
دی۔

محراب نے کھانا تیار کر کے پہلے مریم بیگم اور زامون کو
کھلایا پھر زامون کے دوست کے آ جانے کے بعد اسے
رخصت کر کے مشین لگائی، اتوار ہونے کے باعث ایک
عیلان میں اسے بہت سے کامنٹاں مل رہے تھے۔
مشین لگا کر ساتھ ہی اس نے گھر کی صفائی شروع
کر دی تھی، صفائی سے فارغ ہو کر گریس کے سامان کی
لسٹ تیار کی پھر مریم بیگم کو گرم پانی سے ہاتھ دھوا کر خود بھی
نہائی اور اسی طرح گرم کبل میں دیکھ گئی تھی۔
مغرب کے قریب کہیں اس کی آنکھ مریم بیگم کی پکار پر
کلپ گئی۔

”محراب... اٹھ جاؤ بیٹے عصر کی نماز تو قضا ہو گئی،
مغرب کی نماز تو پڑھ لو۔“ اس نے اٹھ کر وقت دیکھا تو
مغرب کی نماز کا وقت تنگ پڑ رہا تھا۔
ہال کلب میں مقید کرنی جلدی سے اٹھ کر وضو کر کے
نماز پڑھی پھر رات کے کھانے کی تیاری شروع کر دی۔
چاول ابھی دم پر تھے جب چائیکدو وارے پر دستک
سے وہ چونک اٹھی۔ پہلا خیال زامون کی واپسی کا تھا،
بھاگ کر دروازہ کھولا تو سامنے بڑے بھائی کو دیکھ کر حیران
رہ گئی۔

”السلام علیکم بھائی۔“
”وعلیکم السلام! زامون ہے گھر پر؟“ وہ شاید بہت
جلدی میں تھے محراب نے بھی میں سر ہلادیا۔
”نہیں تو... وہ تو نہیں ہیں، آپ امداد آ جائیں
پلیز۔“

”نہیں... مجھے کام ہے اسی زامون کے لیے ضد
کر رہی تھیں انہیں یہاں چھوڑنے آیا ہوں۔“ غلت
بھرے انداز میں کہتے وہ پلیٹ کر گاڑی تک گئے پھر سبز

رجیم کا ہاتھ تھام کر انہیں گاڑی سے نکلنے میں مدد دی۔ وہ
اندھا نہیں تو وہ محراب بے حد اصرار کے باوجود باہر سے ہی
فورا رخصت ہو گئے تھے محراب نے دیکھا فقط کچھ ہی
عرصے میں مسز رجیم بے حد بدل کر رہ گئی تھیں۔ خاموش،
سبکی سبکی سی، پریشان اور بے حد کمزور مسز رجیم جو کبھی لال
حویلی میں بے حد عبادتِ شخصیت ہوا کرتی تھیں۔

ابھی کچھ وقت پہلے جب وہ آترہ کے ساتھ حویلی گئی
تھی تو انہوں نے کتنا برا سلوک کیا تھا اس کے اور اس کی
پس کے ساتھ مگر اس وقت وہ بہت بدلی ہوئی لگ رہی
تھیں، محراب کو سامنے دیکھ کر انہوں نے محبت سے اس
کے سر پر ہاتھ بھیرا اور جس وقت وہ انہیں مریم بیگم کے
پاس لے کر آئی وہ ان کے گلے لگ کر بہت شدت سے
رہی تھیں۔ یوں جیسے اپنے ہر قصور اور خطا کی معافی مانگ
رہی ہوں۔ محراب کو ان کا یہ نرم اور مشفق رویہ بے حد اچھا
لگا۔

اس نے چاول پکا لیے تھے، مسز رجیم کو چائے دے کر
وہ ابھی باؤل میں رننگ کے لیے وہی پچینٹ رہی تھی
جب زامون بھی واپس آ گیا۔ مریم بیگم کے کمرے سے
باتوں کی آواز سن کر وہ چوٹا لگا تھا۔

”کوئی آیا ہے کیا؟“
”ہاں۔“ گیت بند کر کے پلٹتے ہوئے محراب نے
جواب دیا جب اس نے پوچھا۔
”کون آیا ہے؟“

”خود ہی دیکھ لو چل کر۔“ محراب اس کا سر پرانہ خراب
نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ایک نظر اسے دیکھا مریم بیگم کے
کمرے کی طرف چلا آیا نظر جیسے ہی سامنے بیٹھی مسز رجیم
پر پڑی اس کا چہرہ جیسے کل تھا۔

”ای...“ چند لمحوں کے لیے بعد میں جیسے بے
یقین سی ہو گئی تھیں۔ مسز رجیم نے اس کی پکار پر نگاہ اٹھائی
اور پھر اسے دیکھتے ہی رو دیں۔

”زامون میرے بچے... میرے لعل۔“ ٹپک کر
اسے ساتھ لگاتے ہوئے وہ جذباتی ہوئیں۔ زامون کو لگا

جیسے اس کے سارے غموں پر کھرٹا گیا ہو۔

اب مجھے۔

ماں کے مہربان سینے کے لکس نے اس کی ساری
تھکان اتار دی تھی۔ اس رات وہ اور زارون دیر تک مریم
بیگم اور مسز رحیم کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔
زارون نے انہیں اپنے علاج اور بیرون ملک روانگی کے
متعلق بھی بتا دیا تھا، مسز رحیم کی خوشی اس کی صحت یابی کے
بارے میں جان کر دیکھنے کے لائق تھی۔

انہوں نے زارون کو بتایا تھا کہ لال حویلی میں حالات
بہت خراب چل رہے تھے، سردار عبداللطیف اپنے بیٹے
کے علاج کے لیے اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ بیرون ملک
شفٹ ہو رہے تھے جبکہ زارون کے بڑے دونوں بھائیوں
میں سرداری کے لیے اختلافات اور جھگڑے اس قدر بڑھ
گئے کہ دونوں نے ایک دوسرے سے قطع تعلقی کر لیا۔

اپنے اپنے مفاد اور جھگڑوں میں دونوں بیٹوں کے
پاس ماں کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ ذرا سا وقت اور ذرا
سی محبت بھی نہیں بھیجی تھی۔ یہی سبب ہو کر انہوں نے
بڑے بیٹے سے درخواست کی تھی کہ وہ انہیں زارون کے
پاس چھوڑ آئے اور وہ بلا چوں و چراں ملن گیا تھا۔ یوں
جیسے وہ خود بھی یہی چاہتا ہو۔ زارون حویلی کے حالات پر
دکھی ہونے کے باوجود سکرا دیا تھا۔

”پتا ہے امی، کچھ گناہ ایسے ہوتے ہیں جنہیں اللہ
رب اعزت تو معاف کر دیتا ہے مگر انسان معاف نہیں
کرتے مایہ گناہ جن پر اللہ کی پکڑ سے زیادہ لوگوں کی پکڑ
ہوتی ہے، وہ رحمان و رحیم ترس کھا لیتا ہے اپنے بندے پر
لوگ نہیں کھاتے امی، لوگ نہیں بھولتے، میرے گناہ بھی
بس کچھ ایسے ہی ہیں۔“ مگر اب نے دیکھا اس کی لمسی میں
بے حد کرب چھپا تھا، وہ اسے دیکھتی رہی، رات وہ سونے
کے لیے کمرے میں آئی تو زارون جاگ کر اس کا انتظار
کر رہا تھا۔

”کیا ہوا سوئے نہیں ابھی تک؟“ ٹائٹ کریم لگاتے
ہوئے اس نے اسے دیکھا جب وہ بولا۔

”ہوں تمہارا انتظار کر رہا تھا تمہارے بغیر نیند نہیں آتی

”اچھا اور اگر تمہاری دوسری بیوی والہیں آگئی پھر؟“
”کچھ نہیں، ایک رات تمہارے ساتھ اور ایک اس
کے ساتھ۔“

”اس کے ساتھ نیند آ جائے گی۔“ ہمیشہ کی طرح وہ پھر
جل گئی تھی زارون مسکرا ہٹا ہٹا کر۔

”پتا نہیں، یہ تو اس کے ساتھ سو کر ہی پتا چلے گا۔“
”چلو اللہ کرے تمہاری یہ خواہش جلد پوری ہو۔“
”آمین۔“ وہ کہاں باز آنے والا تھا مگر اب کچھ کراسے
دیکھتی اپنی سائینڈ پر کروش بدل کر سو گئی۔
”کیا ہوا، کچھ غلط کہہ دیا میں نے؟“
”نہیں، سارے دن کی تسکین ہوئی ہوں نیند آ رہی ہے
مجھے۔“

”وہاں اگر تھکن زیادہ ہے تو؟“
”نہیں۔۔۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں ہے، بس سو جاؤ
چپ چاپ۔“ وہ کہاں اب اس کی شنوائی تھی۔
زارون اس کی سلامتی پر دل کھول کر مسکراتا خود بھی
سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

زارون کی ٹکٹ کنفرم ہو گئی تھی۔ مگر اب کے اندر عجیب
سی جگ چھڑ گئی تھی۔ ایک طرف زارون اس کے لیے
جان سے پیاری بہن کا قاتل تھا تو دوسری طرف دل اب
اس کی چاہ کرنے لگا تھا۔ اس کی جدائی کا تصور کرتے ہی
ایک عجیب سی آگ میں جلنے لگتا، وہ خود کو اس کی محبت سے
باز رکھنا چاہتی تھی مگر نکاح کا مضبوط بندھن جیسے اس کی ہر
خطا کا بت توڑ دینے پر تیار کیا تھا۔

نایاب پیچھے جا رہی تھی اور دل کی خود سری دہل و دماغ پر
حاملی ہوئی جا رہی تھی۔ اگر اس نے بہن کھولی تھی تو زارون
عبدالرحیم نے بھی اپنا محبوب کھو دیا تھا۔

اس کی جان سے پیاری بہن کو ابھی نیند سنانے والا
خود بھی ابھی نیند سو گیا تھا۔ نقصان برابر کا تھا تکلیف بھی
برابر کی تھی پھر وہ کس برے پر اپنی نفرت کا وجود قائم رکھتی؟

اب اسے سمجھ آ رہا تھا کہ اسے زارون عبدالرحیم کی زندگی میں خزانہ لویہ کا وجود کیوں ملتا تھا؟ زارون کی اس کی طرف نرم دلی سے اسے کیوں جھپتی تھی؟ جیسے جیسے زارون کے جانے کے دن قریب آ رہے تھے ویسے ویسے ایک بے نام کی چپ اور ادا سے دل اور لہجوں کا معاملہ کر لیا تھا، زارون یہ بات سمجھتا تھا مگر سمجھ کر بھی انجان بنا ہوا تھا۔

غزالہ کے ساتھ اس کا کیا معاملہ چل رہا تھا اس نے محراب کو اس بارے میں شریک کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ عدالت میں بچے کے وجود سے صاف انکار کے بعد اس نے یہ درخواست بھی پیش کر دی تھی کہ غزالہ کی کوکھ میں پلنے والا بچہ اس کا بچہ نہیں ہے لہذا بچے کا ڈی این اے ٹیسٹ کر لیا جائے، عدالت نے اس کی درخواست مان لی تھی۔ غزالہ جو اسے سبق سکھانے کے چکروں میں تھی خود اپنی ہی چال میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ اگلی پیشی پر وہ ڈی این اے رپورٹ پیش کرنے کی بجائے اپنا کیس واپس لے رہی تھی۔ یہاں بھی زارون نے اسے سستے میں نہیں چھوڑا بلکہ عدالت میں اس کی بدکرداری ثابت کر کے وہیں بیٹھ اور حاضرین کے سامنے بھی اسے اپنی ذات اور اپنے نام سے آزاد کر دیا تھا۔ غزالہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ معذور ہو کر بھی وہ شخص یوں اسے زمین چٹا دے گا۔ بھری عدالت میں کردار پر کچھ اور پھر طلاق بہت ہی بدنامی داغ تھے اس کی ذات پر یوں کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہی تھی۔

انسان پر وہ طرح کے مشکل حالات آتے ہیں ایک جو اس کے لیے آزمائش ہوتے ہیں اور دوسرے سزا، غزالہ لویہ کے لیے بھی اس کی زندگی میں آنے والی مشکلات اس کے اپنے غلط اعمال کی سزا تھی۔

☆ ☆ ☆

اس ریڈ زارون کی رونا گئی تھی۔ محراب نے کام سے چھٹی کر لی تھی اس کا آج کل کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہا رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے زارون چلا گیا تو بچے کچھ نہیں رہے

گا۔ شام میں اس کی فلائٹ تھی، محراب نے کل رات ہی اس کا بیگ اور دیگر سامان تیار کر کے رکھ دیا تھا اور بات تھی کہ بیگ تیار کرتے ہوئے کتنی ہی بار اس کی آنکھیں بھری گئیں۔

اس وقت بھی وہ مسز رحیم اور مریم بیگم کے پاس بیٹھا اپنے علاج اور اخراجات سے متعلق ساری معلومات بیان کر رہا تھا جبکہ محراب کچن کی ٹیبل پر پیاز کاٹتے ہوئے چپ چاپ رہی تھی۔ زارون کب کمرے سے نکل کر کچن کی طرف چلا آیا اسے مطلق خبر نہ ہوئی۔

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا تو محراب نے چونک کر سر اٹھایا۔

"کہاں؟"

"جسٹیس پوچھ رہا ہوں، کیا ہوا، کیوں رو رہی ہو؟" اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ محراب نے بے ساختہ جلدی جلدی آنکھیں صاف کر لیں۔

"کچھ نہیں، پیاز میں پانی ڈالنا بھول گئی تھی۔"

"اچھا... میں سمجھا شاید میرے جانے پر افسردہ ہو۔" "مجھے کیا ضرورت ہے تمہارے جانے پر افسردہ ہونے کی، مت بھولو کہ تم میری بہن کے قاتل ہو۔" وہ خواہ مخواہ غصہ ہوئی، زارون اسے دیکھ کر ہنس گیا۔

"تمہارا بھی تو ہوں۔"

"وہ تو تم کسی اور کے بھی ہو۔"

"اس کا یہاں کیا ذکر، میں صرف تمہاری بات کر رہا ہوں۔"

"ہاں مگر تم صرف میرے شوہر نہیں ہو۔"

"تو جسٹیس اس بات کا غصہ ہے۔"

"مجھے کیوں غصہ ہونے لگا اس بات کا؟" وہ پھر چڑی زارون مسکرایا۔

"جسٹیس کس نے بتا دیا کہ مجھے تمہارا غصہ ہونا چھوڑنا چاہیے؟" محراب کے احماد کو چکیوں میں کیسے اڑانا ہے وہ اچھی طرح جانتا تھا اور اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔

"کب جانا ہے تم نے؟" جب کوئی بات سن کر پڑی تو
 یہی پوچھ لیا زارون قریب آیا۔
 "تم کہتو ابھی چلا جاتا ہوں۔"

"میرے اتنے فرماں بردار معذور ہونے سے پہلے تو
 نہیں تھے تم۔" اچانک اس نے کہا اور زارون کی مسکراہٹ
 سٹ گئی تھی۔

"ہاں تب اپنی جوانی اور شخصیت کا غرور تھا مگر میرے
 رب نے دکھایا اس دنیا کی ہر چیز، یہاں تک کہ زندگی بھی
 محض ایک فریب ہے، انسان جب گمراہی سے راہ راست
 کی طرف آتا ہے تو یونہی بدل جاتا ہے۔" اس نے برا نہیں
 منایا محراب کو اپنے الفاظ اور لہجے پر فوراً شرمندگی نے گھیر لیا
 تھا۔

"واپس کب تک آؤ گے؟"

"کوئی پتا نہیں۔ جب ڈاکٹرز نے پھنسی دے
 دی۔"

"رابطے میں تو رہو گے ناں تم؟"

"ہاں مگر روز نہیں کیونکہ تم جانتی ہو ہمارے حالات
 ابھی زیادہ اچھے نہیں ہیں۔"

"ہوں۔"

"مجھے یاد کرو گی کہ نہیں؟"

"پتا نہیں۔ جاؤ گے تو پتا چلے گا۔"

"میں بہت یاد کروں گا تمہیں بلکہ تم سے بھی زیادہ
 تمہارے تنگدو کو۔" اس بار محراب کے لبوں پر مسکراہٹ
 بکھر گئی تھی، بے ساختہ نظر اٹھا کر زارون کو دیکھا تو وہ اسے
 ہی دیکھ رہا تھا۔ روشن مقناطیس لگا ہوں میں کیا کچھ نہیں تھا
 وہ بس چند لمحوں دیکھ پائی پھر نظر جھکا لی۔

رات دس بجے اس کی فلائٹ تھی اس کا دوست
 ساڑھے آٹھ بجے سے اس کے انتظار میں ڈرائنگ روم
 میں بیٹھا تھا۔ محراب نے جلدی جلدی اسے کپڑے تبدیل
 کما کر جوتے بھی پہنا دیے۔ ہائی تیری وہ خود کر چکا تھا۔
 جس وقت وہ اس کی ضرورت کی اشیا کا بیگ میں جائزہ

لیا تو اس نے کہا۔

"انسان پر اچھا برا وقت آتا رہتا ہے محراب، مگر میرے
 برے وقت میں جس طرح سے تم نے میرا ساتھ نبھایا ہے
 مرکز بھی نہیں بھول سکتا تمہارے اس احسان کو، اپنا بہت
 خیال رکھنا پلیز کیونکہ تم میرا کل اٹالہ ہو۔" محبت پاش
 نگاہوں اور اس کے تیکھے نقوش کا جائزہ لیتا وہ جیسے اپنے
 جذبے بلنا رہا تھا محراب سے نظریں اٹھانا محال ہو گیا تھا۔

"میرا انتظار کرو گی ناں؟" آہستہ سے اس کا ہاتھ
 تھامتے ہوئے بہت دیر سے اس نے پوچھا محراب چاہ کر
 بھی اس کا ہاتھ نہ توڑ سکی۔

"ہاں۔" اس کا سر اثبات میں ہلا اور زارون کو لگا جیسے
 اسے قہر میں کاغذ اٹل گیا ہوتا۔ ہستہ سے اپنے لب محراب
 کی صبح پیشانی پر ثبت کرتے ہوئے جیسے اس نے اسے اپنا
 انتظار تھا دیا تھا۔

آرہ اس وقت میز پر ٹھل رہی تھی جب اس نے
 زارون کو باری باری مسز رحیم اور مریم بیگم سے مل کر ان کا
 پیار لیتے ہوئے گاڑی میں بیٹھتے دیکھا اس وقت اس نے
 موہاگل اکال کر مدنی صاحب کا نمبر ملا لیا تھا۔

"السلام علیکم! اکال آرہ بات کر رہی ہوں۔" کال
 ریسیو ہوتے ہی وہ بولی۔

"ہوں۔۔۔۔۔ جانتا ہوں، وہ علیکم السلام کہو اس وقت کیسے
 کال کی۔"

"ضروری بات کرتی تھی، وہ لڑکا اب روڈ جا رہا ہے۔"
 "کون سا لڑکا؟" ان کے ذہن میں نہیں تھا جب وہ
 بولی۔

"وہی محراب کا شوہر، علاج کی غرض سے باہر جا رہا
 ہے، آپ نے جو بھی سوچا ہے اس پر فوری عمل کی ضرورت
 ہے کیونکہ محراب اپنے شوہر کے واپس آنے کے بعد جاب
 نہیں کر سکی۔"

"کیوں۔۔۔۔۔ اسے کیا ہو گیا اچانک اور اگر اس نے
 جاب چھوڑ دی تو شہر بارہا لے معالے کا کیا ہوگا۔"
 "اس کا کچھ نہیں ہو سکے گا کیونکہ مجھے نہیں لگتا وہ اپنے
 شوہر سے طلاق لے گا۔"

naeyufaq.com

آنچل کی جانب سے ایک اور آنچل

حجاب کرکچی

محبت و نظرت کی آمیزش سے مزین و قابل فہمائش مباحث

مرگ تمنا

خاندانی رسم و رواج کس طرح لڑکیوں کو باقی کرتا ہے
اور اطلاق کے نوک قلم نثری ایک خوب صورت تحریر

عبدالمحبت

رشتوں میں اپنی مناد کے لیے زیر گھول والوں کا قصہ حیات
جو خوب تو تباہی کی طرف تیز سے دوڑ رہے ہوتے ہیں اور اپنے
ساتھ کی ہر رشتوں کو بھی نہ ہوائی نقصان پہنچا رہے ہوتے ہیں

میراج سخن

ذاتی معیاری شاعری پر مبنی سلسلہ

اس کے بارے

میں چن چن کر منتخب ہوتے ہیں اور ان کے
میں سے منتخب ہوتے ہیں اور ان کے
میں سے منتخب ہوتے ہیں اور ان کے

Info@naeyufaq.com

0300-8264242

"تمہارے سارے کام آدھے اچھے اور آدھے ہی ہوتے
ہیں آؤ۔" بھائی صاحب خفا ہوئے تو آؤ نے بات
پلٹ دی۔

"آپ پریشان نہ ہوں، آپ کا بڑا مسئلہ شہر پار بھائی
کی بیوی ہے، بس سمجھیں اس سے جان چھوٹ گئی آپ
کی۔"

"ہواؤں میں تیر چلانا چھوڑو اور عملی طور پر کچھ کر کے
دکھاؤ۔"

"ٹھیک ہے ان شاء اللہ بہت جلد خوشخبری سناؤں گی
میں آپ کو۔" اس نے تسلی دی، بھائی صاحب نے فون
کاٹ دیا۔

گازی میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھے زارون کی نگاہ اس پر
پڑی تو اس نے اشارے سے کچھ فاصلے پر کھڑی عراب کو
پاس بلایا پھر کھڑکی کھول کر سرگوشی میں بولا۔

"بھتیجی سے نصیحت کر رہا ہوں تمہیں جتنا ہو سکے اس
لڑکی سے احتیاط رہنا تمہاری خیر خواہ نہیں ہے یہ کچھ دوست
آستین میں پیچھے سانپوں سے زیادہ خطرناک ہوتے
ہیں۔"

"اوکے۔" وہ محض سر ہلا سکی، زارون مطمئن سا اسے
دیکھ کر رہ گیا۔

زارون کی گازی کے دواخانہ ہوتے ہی آؤ نے ہاتھ ہلا
کر اسے مسکراہٹ پاس کی۔ وہ جواباً مسکرا کر اسے دیکھتی
واپس پلٹ گئی۔ ساگل نے دھڑک دھڑک کر اس کے سر پر سوار تھی۔

"السلام علیکم ایسیسی ہوتا" عراب رلت بھر جا گئے کے
باعث تاخیر سے اٹھی تھی بھی نہیں ہی بستر میں بیٹھی رہی۔
"وعلیکم السلام! ٹھیک ہوں اور تم سے بہت شرمندہ
بھی۔"

"کوئی بات نہیں بھائی اگلے سے بات کی تھی میں
نے بہت خفا ہوئے وہ تمہارے اچانک جاب چھوڑنے کا
سن کر کیونکہ ان کے اصول ان کے لیے سب سے اہم ہیں
بہر حال جب تک تمہارا شو ہر ٹھیک ہو کر واپس نہیں آ جاتا تم
جاب جاری رکھو جب وہ آ جائے پھر بے شک چھوڑ دینا

کوئی مسئلہ نہیں۔

”ٹھیک ہے۔“

”اچھا کچھ اور بھی بتانا تھا تمہیں، شہریار بھائی کی بیوی جو ہے ماں شہزین، شہریار بھائی اس سے بہت پیار کرتے ہیں مگر چونکہ کاروباری مخالفت میں ہمدانی انکل بھائی کو پسند نہیں کرتے اس لیے دونوں الگ ہیں، تم نے ایک کام کرنا ہے میرے ساتھ مل کر ان دونوں کو پھر سے ایک کرنا ہے۔“

”وہ کیسے..... میں ان کی صرف ملازمہ ہوں، میں ان کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟“

”کر سکتی ہو، شہریار بھائی کی بیٹی تمہارے لیے ترپ کا پتا ہے تم اسے استعمال کر کے سب کر سکتی ہو۔“

”نہیں یار..... ایم سوری، میں ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہتی۔“ محراب کو ابھمن ہوئی تھی مآثرہ پشیمانی۔

”ایسا مت کہو یار میں نے شہریار بھائی سے وعدہ کیا ہے ان کی مدد کرنے کا۔“

”تو تم کرو مگر مجھے اس میں شامل مت کرو پلیز۔“ وہ صاف انکاری ہوئی مآثرہ کے اعتراف طیش کا بال بال اٹھا مگر وہ دبا گئی۔

”دوری گند..... تمہیں یاد ہے تمہاری ہر مشکل میں نے بنا کسی لالچ یا صلے کے تمہارا ساتھ دیا تمہاری مدد کی ہوتا آج جب مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے تو تم صاف انکاری ہو گئی، بس یہی صلہ ہے تمہاری نظر میں میری دوستی کا۔“

”اب وہ بلیک میلنگ پر آئی تھی۔ محراب کا سر جھک گیا۔

”سوہی یار میں ان امیر لوگوں کی ذالی زندگی میں مداخلت کی حامی نہیں ہوں، ایسے ہی کل کو کوئی بات ہو گئی تو.....“

”کوئی بات نہیں ہوگی، میں گارنٹی دیتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے مگر میں کیا کر سکتی ہوں؟“

”میری مدد کرنی ہے تمہیں۔“

”کیسے؟“

ایک توہین ماں کی بچی کو ماں اور باپ دونوں کا بدلہ جائے گا اور دوسرا میرے وعدے کی لالچ بھی رہ جائے گی۔“

”ٹھیک ہے۔“

”شکریہ یار..... میں جانتی تھی تم ہرگز احسان فراموش نہیں ہو سکتی۔“ محراب کی حامی نے اس کے چہرے کی رونق بحال کر دی تھی۔ محراب کو پہلی بار وہ کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔

مطلبی، مفاد پرست، احسان جتانے والی، شاید زمرہ ان اس لڑکی کے بارے میں زیادہ بہتر جانتا تھا۔

اس روز آثرہ نے اسے کام سے چھٹی کے بعد گھر واپس کی بجائے ایک ریسٹوران کے باہر ڈراپ کیا تھا،

شہریار کی بیٹی محراب کے ساتھ تھی اور اسے اسی بچی کو اس کی ماں سے اسی ریسٹوران میں ملانا تھا۔ شہریار کی بیوی

شہزین اسی شام اسی ریسٹوران میں اپنی ایک دوست کے ساتھ کھانا کھانے آئی ہوئی تھی محراب کے ساتھ اپنی بیٹی کو دیکھ کر وہ فوراً پک کر ان کے قریب آئی تھی۔

”پری..... ماما کی جان، تم یہاں کیسے؟“ وہ بوج کر سینے سے لگاتے ہوئے وہاں بے طرح خوش ہوئی تھی

محراب کو بے جدا چھانکا آثرہ ایک مرتبہ پھر اس کی نظروں میں معتبر ہو گئی تھی۔

”میرے ساتھ آئی ہے پری۔“ آثرہ کی ہدایت کے عین مطابق اس نے جواب دیا۔ شہزین فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”تم کون ہو؟“

”شیف ہوں پری کی۔“

”اوکے..... آؤ میرے ساتھ۔“ وہ اسے اپنی ٹیبل پر لے آئی۔ اس شام محراب اور پری نے شہزین کے ساتھ

کھانا کھایا، واپس پر جب محراب اس سے رخصت لے رہی تھی اس نے اسے اپنا کارڈ دیا اور یہ درخواست کی تھی کہ

وہ گاہے بگاہے بچی کو اس سے طوائف رہے محراب نے وعدہ کر لیا تھا۔

ریسٹوران سے نکلتے ہوئے محراب نے اپنے گھر کی گاڑی پر

بٹھی تو آرزو شدت سے اس کی سختی۔

"کیا بتا۔"

"کچھ نہیں، اپنا کارڈ دیا ہے اس نے اور دوبارہ پھر بچی سے ملنے کی درخواست کی ہے۔"

"گڈ..... لاؤ کارڈ مجھے دے دو۔" محراب نے کارڈ اسے دے دیا۔ جیسے ہی آرزو نے گاڑی اسٹارٹ کی وہ پوچھے بغیر بندہ کی۔

"تم کیوں نہیں ملیں شہزین سے؟"

"مجھے پہچانتی ہے وہ، ہمدانی اٹکل کو ہٹا چلا گیا تو خفا ہوں گے۔"

"میرا ہٹا چل گیا تو؟"

"تمہارا شہزیار بھائی منجیل لیس کے فکر نہ کرو۔" احتیاط سے موٹر کائنچے ہوئے اس نے اسے مطمئن کیا۔ اگلے چند منٹ کے بعد محراب کو اس کے گھبراہٹ کر وہ بھی پری کو اپنے ساتھ ہی لے لی گئی۔

ہمدانی صاحب چونکہ اس کے پل پل سے آگاہ تھے لہذا اس رات شہزیار کو بھی انہوں نے ہی مطمئن کر دیا تھا۔

دن یونکی تیز رفتاری سے گزر رہے تھے۔ زامون کی کال آئی تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک مگر اس کے بغیر اس تھا۔ ڈاکٹر نے ابھی اس کے آپریشن کی تاریخ فائنل نہیں کی تھی۔ محراب کو اس سے بات کر کے بے حد اچھا لگا، گزرتے ہر دن کے ساتھ زامون کی محبت اس کے اندر اپنی جڑیں مضبوط کر رہی تھی مگر اس نے زامون کو نہیں بتایا تھا۔

اس روز اسے شہزین کے گھر جانا تھا پری کو لے کر اور آج کے دن کے لیے آرزو نے اسے خصوصی ہدایات دی تھیں۔ آج اسے نہ صرف پری کو اس سے ملوانا تھا بلکہ شہزیار کا گفٹ بھی جو آرزو نے اسے دیا تھا اس تک پہنچانا تھا۔ آرزو نے اسے کہا تھا آج کے بعد شہزیار اور شہزین کو ملوانے کے لیے اسے کوئی مزید کوشش نہیں کرنی پڑے گی کیونکہ شہزیار کا تھکا پکا شہزین خود ہی اس کے گھر چلی آئے گی۔ محراب کو اور کیا چاہیے تھا۔

ایک طرف بنک باگی پری طرف بہت سارے

احسانات کا قرض اس نے حامی بھری تھی۔ شہزین نے اسے پری کے ساتھ خود اپنے گھر بلایا تھا محراب ٹھیک ٹوبے مطلوبہ جگہ پر پہنچ گئی تھی۔

آرزو ہمیشہ کی طرح گاڑی میں بیٹھی رہی اور اس نے وہیں اس کا انتظار کرنے کو کہا تھا، محراب پری کے ساتھ شامدرنگ میں داخل ہوئی تھی۔

اس شام شہزین کا بھائی اور ماں باپ دونوں کسی تقریب میں شرکت کرنے گئے ہوئے تھے اسی لیے شہزین نے موقع دیکھ کر پری کو وہاں بلوایا تھا تا کہ اس کے ساتھ زیادہ وقت گزر سکے۔ محراب نے پری کے ساتھ شہزیار کا گفٹ بھی اس کے حوالے کر دیا۔ شہزین اسے کھانے پر روکنا چاہتی تھی، اسے اس سے کچھ شیر بھی کرنا تھا لہذا آرزو کی نہ رکنے کی سخت ہدایت کے باوجود وہ رک گئی تھی۔ کھانا لکھنے میں ابھی وقت تھا جب شہزین اسے اپنے کمرے میں لے لی۔

"کب سے ہو تم ہمدانی ویس میں؟"

"ایک ماہ ہوا ہے۔"

"ہوں..... چاب کیسے ملی؟"

"ایک دوست کی توسط سے۔"

"دوست تو نہیں ہو سکتی وہ تمہاری۔" دونوں پاؤں سیٹ کر صوفے پر بیٹھی اچانک وہ ہنس دی۔ محراب چونکی۔

"کیوں؟"

"کیونکہ ایک دوست اپنی دوست کو ہمدانی ویس جیسی جگہ پر چاب نہیں کرا سکتی۔"

"کیوں..... ایسا کیا ہے ہمدانی ویس میں؟"

"جسہیں نہیں ہوتا۔"

"نہیں۔"

"آمیزنگ بار، ایک ماہ میں کسی نے کچھ نہیں بتایا جسہیں؟"

"نہیں..... میری بات ہی نہیں ہوتی کسی سے۔"

"اور..... یہ غائب صواب بھی تمہارے ہمدانی صاحب

نے لاگو کیا ہوگا۔

"بات کیا ہے مجھے تا میں پلیز۔"

"تا دوں گی، تم اچھی لڑکی ہو، سادہ اور معصوم اس لیے میں نہیں چاہتی تمہارا بھی کوئی نقصان اور پہلی فرصت میں تم یہ جاب چھوڑ دو پلیز۔"

"ٹھیک ہے مگر بات کیا ہے مجھے تا میں پلیز۔"

محراب کے ہاتھ ٹھنڈے ہونے لگے تھے۔ شہزین نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"بھائی پلیس لڑکیوں کے لیے محفوظ جگہ نہیں ہے، یہ جو بھائی صاحب ہیں ناں بہت بڑے سرجن ہیں، نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں میں جن کرایے لوگوں کو جاب دیتے ہیں جو بہت مجبور اور لاوارث ہوں، جن کے پیچھے کوئی مضبوط ہاتھ نہ ہو، دوران ملازمت موقع ملنے پر یہ پھر انکی افرو میں سے جو بھی ہاتھ لگے اسے بے ہوش کر کے اس کے جسم سے قیمتی آرگنوز چوری کر لیتے ہیں اور پھر وہ اپنے مخصوص لوگوں کے ہاتھ فروخت کر کے پیسہ بناتے ہیں۔ جوان کے ہاتھوں لٹ جاتا ہے اسے ذرا کر خاموش کرادیتے ہیں میری سگی خالہ کو اس سال اپنے گھر کے قید خانے میں زنجیروں میں باندھ کر رکھا اس شخص نے اسی لیے پاپا کو جیسے ہی ان کی اصلیت پتہ چلی انہوں نے ان سے کنارہ کشی کر لی۔ ہاں شہزادے تصور ہے وہ باپ کے مکروہ کاروبار میں ان کا حصہ دار نہیں ہے اور اسے یہ یقین بھی نہیں ہے کہ اس کا باپ اتنا غلط کام کر سکتا ہے اسی لیے مجھ سے شدید محبت کے باوجود وہ مجھ سے الگ رہ رہا ہے کیونکہ وہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑنا چاہتا۔" محراب کے وہم و خیال میں بھی نہیں تھا کہ بھائی میس کی کہانی یہ نکلے گی۔ اس کی پیشانی اس وقت پسینے سے تر ہو گئی تھی۔ جانے کیوں اس لمحے اسے شدت سے زامون یاد آیا تھا۔ اس کا شوہر، اس کا محافظ، اس کا سچا خیر خواہ۔ شہزین نے اس کی گھبراہٹ دیکھ کر نرمی سے اس کا ہاتھ دبا دیا۔

"پیشانی ہونے کی ضرورت نہیں، اللہ نے چاہا تو وہ

مفصّل اب تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا کیونکہ تم اس کی اصلیت جان گئی ہو، ہاں اس دوست سے فوراً کنارہ کشی کر لو جس نے تمہیں اس جال میں پھنسانے کے لیے یہ جاب دلائی پلیز۔" وہ وہی بات کر رہی تھی جو زامون کہتا تھا اور اسے برا لگتا تھا۔

اسی وقت ملازمنے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو شہزین اسے زبردستی کھانے کی میز پر لے آئی۔ محراب کا دل اس وقت ٹوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا مکروہ ضبط کیے بیٹھی رہی۔ چند لمحوں کے بعد ملحق سے امداد کر اس نے شہزین سے رخصتی کی اجازت لی تھی۔ بالکل ماؤف مصاب کے ساتھ وہ جنگل سے باہر روٹ پڑی تو آرزو فرما گاڑی اس کے پاس لے آئی۔

"آؤ بیٹھو۔" سنیان سڑک پر وہ اس کے ساتھ کوئی تماشہ افروز نہیں کر سکتی تھی بھی چپ چاپ بیٹھ گئی۔

"اتنی دیر کیوں لگاؤں تم نے کہا بھی تھا جلدی آ جانا۔"

"کھانے پر روک لیا تھا اس نے۔" بمشکل اس کے ملحق سے آواز نکل سکی آرزو جو گئے تانندہ لگی۔

"تمہیں کیا ہوا۔"

"کچھ نہیں۔۔۔ زامون یاد رہا ہے۔"

"اے۔۔۔ تم لڑکیاں بھی ہیں بھی نہیں سدھر سکتیں۔"

آرزو کو پرانا محراب کی آنکھیں بھرا آئیں۔

"سچ کہا، ہم لڑکیاں بھی نہیں سدھر سکتیں اپنے محافظوں کے خلاف آزادی مارچ، موت مارچ جیسے تماشے لگاتی پھرتی ہیں ہم۔" وہ اپنے حواس میں نہیں آئی، آرزو دل کھول کر فیس دی۔

"لگتا ہے شہزین بھائی نے کچھ یاد ہی دماغ خوب کر دیا ہے تمہارا۔" وہ چپ رہی، چند لمحے بونٹی خاموشی کی غمزدگی سے جب آرزو بولی۔

"تم چاہو تو شہزین بھائی اور شہزادہ بھائی کی صلح کے بعد جاب چھوڑ سکتی ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" اس کا دماغ حاضر نہیں تھا ہذا وہ کوئی بات نہیں کر پاری تھی لب جو بھی کرتا تھا زامون کو کرتا تھا۔

اگلے روز کے تمام بڑے معاملات میں ایک ہی بی بی خبر تھی شہر کے رئیس صاحب زادہ باسط علی کی اکلوتی بیٹی فہرین علی کو جان سے مارنے کی کوشش، فہرین امیر جنس دم میں انتہائی گھداشت کے ذریعہ رائل۔ تصدیقات کے مطابق فہرین علی کو زہر دیا گیا تھا۔ زہر کیسے لگنے لگا اس پر انکوائری ہو رہی تھی۔ سب سے پہلے یہ خبر بادشاہی نے ماتھے کی پٹری پر چھٹی اور ایک مظلوم کن مسکراہٹ ان کے لبوں پر دیکھ گئی تھی۔

وہ لوگ جس نے انہیں ان کی اصلیت ان کے اپنے ہی بیٹے پر ظاہر کر کے شہر سے گھٹنے کرنے کی دھمکی دی تھی۔ وہ نہ صرف اسے بیٹے سے الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے بلکہ اب شاہی محل کے لیے انہیں اس سے ہٹا کر لے لیا تھا۔ شہر بادشاہی دن لیت اٹھا تھا۔ بیدار ہوتے ہی کب سے بچے سوہاگل کو اٹھا کر دیکھا اس کے تقریباً تمام قریبی دوستوں کی طرف سے بے شمار کاغذ اور مسکرائے ہوئے تھے وہ ہنسنے لگا اور اپنے قریبی دوست کو کال پیک کی تو پہلی ہی بل پر اس کی کال نہ سید ہو گئی تھی۔

”شہر بادشاہی ہو گیا یہ سب بھابی کے ساتھ“ اس کے دوست نے بادشاہی کے کال پیک کرتے ہی پوچھا تو شہر بادشاہی ذرا دیر سے حیرت کا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“

”جسٹیس نہیں جانتا؟“ دوسری طرف اس کے دوست کو

جیسے مدد ملے۔

”نہیں۔ سب خبر تو ہے؟“

”کمال ہے یاد رہی بھابی زندگی اور موت کی جگہ لڑ رہی ہیں اور یہاں تم ہو کہ کہیں کچھ خبری نہیں۔“

”کیا ہوا ہے فہرین کو؟“

”زہر دیا گیا ہے جس کے گرد دواؤں کو لٹ جاتا تھا۔ اس میں صرف یہی سننے کی ہمت تھی کال گانتے ہی بادشاہ دھوئے وہ فوراً کرے سے نکلا اور بھاگ کر پہنچی تک

پہنچا، بھاگ بھاگ گاڑی لالہ سے تیز اٹارنے سے مطلوبہ اسپتال کی طرف بھاگ نکلا۔

کتنے ماہ ہو گئے تھے اس سے کتاہ گئی کیے ہوئے، کبھی اس کی طبیعت کا احساس نہ ہوا تھا جتنا اس لیے اسے کھانسنے کا احساس سے ہوا تھا۔

فہرین کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا اور جب تک وہ ہوش میں نہ آ جاتی اور زہر اس کی زندگی کے اسے میں کچھ بھی کہنے سے قاصر تھے۔ کسی کو کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آخری کیسے ہو کس نے فہرین کو زہر دیا۔ پولیس اپنا کام کر رہی تھی مگر گھر پر سوائے فہرین اور ایک ملازم کے کبھی کسی کا موجود نہ ہونے کی مشکل پیدا ہو رہی تھی۔ ملازم نے جو بیان دیا اس کے مطابق فہرین کی کوئی جاننے والی اس کی بیٹی کو اس سے ملانے والی تھی فہرین نے اسے کھانا کھلا دیا، بیٹی کو وہاں چھوڑ کر رخصت ہو گئی اس بیان میں کچھ بھی عجیب نہیں تھا کہ کب کیا ہوا۔ شہر بادشاہی چلنے پھرنے میں وہیں پہلی باسط۔ لی موجود تھی۔

وہ فہرین کو دیکھتا چاہتا تھا مگر فہرین کے علاوہ بھابی نے اس کی اجازت نہیں دی۔ فہرین کے ہوش مرنے کے پہلے وہ اس کی شکل دیکھنے کے علاوہ بھی نہیں تھے۔ مدد شہر بادشاہی کے چند گھنٹوں کے بعد فہرین کو ہوش آ گیا تھا۔ ہوش مرنے کے بعد جو پہلا بیان اس نے دیا اس سے پولیس کو زہر کا سرسرا ہوا تھا۔ فہرین نے بتایا کہ جو گفت اسے عذاب نے اس کے شوہر کی طرف سے دیا اس کا سچا اور اچھا موجود پہلے فہرین کے قریبی ترین زہر میں لگے تھے۔ گفت کھولتے ہی فہرین ساتھ ساتھ سب کھادی تھی اس کے اچھے کو گتے اور ہر سب کھک گیا تھا۔ پہلے تو یہی اس نے سپرے کی نہیں کیا تھا۔ اگرچہ کبھی تو شاید موقع پڑی اس کی موت ہو جاتی۔ پھر بھابی صاحب نے اپنی ڈاکٹری کا چھوٹا کھانا کھاتے ہوئے یہ سنا لیا کہ یہ کیا تھا۔ ایک پانچ گھنٹہ میں کتنا بے حس ایک پانچ گھنٹہ میں کتنا کرنے والے خالق کی طرف سے موتی بے حس ہو گئے جو خالق چاہتا ہے۔ اپنی طرف سے پھر بھابی

صاحب نے کوئی غلطی نہیں کی تھی مگر پھر بھی پکڑے گئے تھے، جس بیٹے پر اپنی حقیقت ظاہر نہ کرنے کی کوشش میں وہ بہو کی جان لے رہے تھے اسی بیٹے کو ان کی اس حرکت نے ہر بات سے آگاہ کر دیا تھا۔

انسان جب شیطان کا بازو بن کر قدرت کی قائم کردہ حدود کی خلاف ورزی کرتا ہے تو پھر وہ جبار و قہار بھی اسے اس کی اوقات یاد دلانے میں مہلت اور رعایت ختم کر دیتا ہے۔

شہریار اور ہمدانی صاحب کے ساتھ پولیس نے محراب کو بھی گرفتار کر لیا تھا۔ جسے اس سارے قصے کی خبر ہی نہیں تھی۔ زندگی میں دوسری بار اس نے دوستی کے نام پر دھوکہ کھایا تھا اور منہ کے بل گری تھی۔ مریم بیگم اور مسز رحیم کارور کو برا حال تھا۔

سمندر پار بیٹھے زادون عبدالرحیم کو خبر ہی نہیں تھی کہ اس کے پیچھے اس کے پیاروں پر کیسی آفت ٹوٹ پڑی تھی۔ اس کا آپریشن کامیاب ہو گیا تھا اور آج کل وہ ریست پر تھا اس روز بہت دنوں کے بعد اس نے پاکستان کال کی اور تبھی مسز رحیم نے رو کر اسے ساری روداد کہہ سنائی تھی۔ وہ تو سن کر رو گیا تھا۔

محراب اتنی بے خوف کیسے ہو سکتی تھی؟ آڑہ جس کا اس سارے قصے میں مرکزی کردار تھا خطرہ بھانپتے ہی راتوں رات باہر بھاگ گئی تھی۔ محراب کو بعد میں پتا چلا کہ وہ بین ماں باپ اور بہن بھائی کے کابلی رہتی تھی کچھ عرصہ قبل اپنے فیاسی کے ساتھ اس کا شدید جھگڑا ہو گیا تھا جس کے جواب میں اس کے فیاسی نے خودکشی کر لی تھی۔ جس رات محراب نے ٹیرس پر اسے ایک نوجوان لڑکے کے لیے روتے ہوئے دیکھا تھا وہ وہی اس کا فیاسی تھا جس کی موت کے بعد وہ اور بھی زیادہ بگڑ گئی تھی۔ محراب نے زندگی میں کبھی ایسی ذلت کا تصور بھی نہیں کیا تھا جو اسے بے یار و مددگار دیکھنے کو مل رہی تھی۔

لال حویلی کے ماتھے پر کلک کا ایک اور نچکا لگ گیا تھا۔ یقیناً زادون اس واقعے کے بعد اس کی عقل پر ٹھوکنے لگا بھی

کو دانہ کرتا۔ کتنی بار اس نے اسے سمجھایا تھا فصاحت کی تھی کہ وہ آڑہ سے دور رہے مگر اس نے اس کی فصاحت کو ہوا میں اڑا دیا تھا۔ وہ اسی قابل تھی کہ اسے سزا پانے کے لیے اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا۔

فقط چند ہی دنوں میں رو رو کر اس نے اپنی آنکھیں سجا لی تھیں۔ ادھر زادون نے ڈاکٹرز کو اپنی پاکستانی روالگی کے لیے درخواست بھجوا دی تھی، ڈاکٹرز ابھی اسے سفر کی اجازت نہیں دے رہے تھے مگر اس کی خمد اور مجبور کے پیش نظر اسے اجازت مل گئی تھی۔ بتا اپنی حالت کی ہوا کیے اپنے دوست کے ساتھ وہ فوراً پاکستان کے لیے روانہ ہوا تھا مگر اس سے پہلے ہی شہرین نے شہریار اور محراب کو معاف کر دیا تھا۔ جو بیان محراب نے پولیس کو دیا شہرین سمجھ گئی کہ اسے محفل جیل میں پھنسا گیا تھا، وہ بھی بے خبر رکھ کر جھوٹ بولی کہ دوسری طرف شہریار بھی ساری کہانی سے یکسر لاعلم تھا بھی اس نے اسے بھی معاف کر دیا تھا۔

زادون لمبے سفر کے بعد گھر پہنچا تو محراب تیز بخار میں پتک رہی تھی۔ اپنے قدموں پر چلا وہ بے سادگی کے سہارے گھر میں داخل ہوا تو مسز رحیم اور مریم بیگم دونوں اسے دیکھ کر خوشی سے رو دیں۔ وہ ان دونوں سے مل کر انہیں تسلی دیتا محراب کے پاس آیا تو اس کی حالت دیکھ کر اس کا سارا غصہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ فقط چند دنوں میں کیا سے کیا ہو کر رہ گیا تھا۔

”محراب“ وہ سو رہی تھی جب اس کی پکار پر پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ اسے دیکھتے ہی آنسو یوں بہے تھے جیسے موتیوں کی لڑی ٹوٹ گئی ہو۔ زادون نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”کب عقل آئے گی تمہیں محراب کب اپنی عقل کا استعمال کرنا سیکھو گی تم؟“ وہ غصے میں تھا مگر ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ محراب کے آنسوؤں میں شدت آ گئی تھی۔

”ایم سوہی زادون“ مجھے واقعی نہیں پتا تھا میرے ساتھ یہ سب ہو جائے گا۔“

”تمہیں ہمیشہ نقصان اٹھانے کا اپنی غلطی کا احساس

ہوتا ہے۔" اس کے آسوس نے اس کا دل پکھلا دیا تھا۔
محراب نے اس کا ہاتھ یوں مضبوطی سے تھام لیا جیسے
پھر سے کہیں کھو جانے کا اندیشہ ہو۔

"چلو بھول جاؤ سب، آخری خطا سمجھ کر معاف کر دیا
ہوں اس کے بعد کوئی حسانت کی تو بہت برا پیش آؤں گا۔"
وہ اسے مزید اذیت میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتا تھا بھی فوراً
معاف کر دیا وہ بے یقین سی فوراً اٹھ کر اس کے لگے لگ گئی
تھی۔

"تم بہت اچھے و ہزاروں جسم سے بہت اچھے ہو تم۔"
"اچھا قاتل رہتا اب اس بات پر۔" وہ مسکرا دیا محراب
نے اور شدت سے اس کے گرد اپنا حصار باندھ لیا تھا۔

"جائیں وہ لوگ ناں اس بات پر؟"
"نہیں کروں گی اب؟"
"نہیں۔"

"کیوں..... فقط تین ماہ میں اتنی کیسے بدل سکتی ہو
تم؟"

"تم میرے لیے خود کو بدل سکتے ہو تو میں کیوں
نہیں؟"

"یعنی تم نے دل سے معاف کر دیا ہے مجھے؟"
"ہاں۔"

"ہوں..... چلو پھر چھوڑو، ذرا دیکھو تو لوں تمہیں جھوٹ
بولتے ہوئے کیسی لگتی ہو۔" اس نے پھر اسے تنگ کیا۔
محراب بڑپ کر الگ ہوئی۔

"تمہیں یہ سب جھوٹ لگ رہا ہے؟"
"ہاں..... تو اور کیا، ابھی کل تک تو تم مجھے صرف اپنی
بہن کا قاتل سمجھتی تھیں۔"

"اس کل کو تین ماہ ہو گئے ہیں۔" وہ چڑ کر بولی ہزاروں
مسکرا دیا۔

"اچھا بتایا نہیں تم نے۔" وہاں ہاتھ اس کے گال پر
رکتے ہوئے اس نے اسے اپنے حصار میں لیا۔

محراب کو لگا جیسے اس کی تمام آزمائشیں ختم ہو گئی ہوں۔
تمام تکلیفوں نے راحت پالی ہو بھی اس نے اپنا سر مکمل

اتفاق سے اس کے کندھے پر رکھ دیا تھا۔
"وقت نے مجھے سمجھا دیا ہے زامون کہ میں واقعی
تمہارے بغیر کچھ نہیں، ایک طرف عباد تھا جس نے
میرے لیے لوگوں سے غلط سنا اور بتا مجھ سے کوئی صفائی
لیے نہایت خاموشی سے اپنے راستے الگ کر لیے، ایک
لحظے کے لیے بھی اس نے میرا نہیں سوجھا، دوسری طرف تم
ہو جس نے اپنی سگی ماں سے میرے غلط عمل کی کہانی سنی کر
بجائے کسی سزا کے فوراً میرے پاس واپس آ کر مجھے گلے
لگا لیا تھا۔ تم نے ثابت کر دیا زامون صرف تم ہی میری
محبت کے قابل تھے تم نے وہ دیکھا جو عباد نادیکھ سکا، تم
نے میری وہ خطا معاف کی جو عباد نہیں کر سکا۔ انسان
سارے اللہ کے ولی نہیں ہوتے۔ غلطیاں ہو جاتی ہیں،
گناہ ہو جاتے ہیں مگر جو رشتہ ان غلطیوں اور گناہوں پر
آپ کو معاف کر کے آپ کی ڈھال بن جائے وہی آپ کا
حقیقی مضبوط رشتہ ہوتا ہے۔" پہلی بار وہ اس سے اپنے اعدا
کا ذکر شیر کر رہی تھی۔ زامون نے اس کی جلتی جوشانی چوم
لی تھی۔

"اب تو واقعی تمہارے قابل ہو گیا ہوں، دیکھ لو اپنے
پاؤں پر چل کر آیا ہوں اور وہ جو غزال سی بلا لگی زندگی میں
اسے بھی دھول چٹا آیا ہوں، اللہ نے چاہا تو زندگی میں اب
کبھی تمہاری آنکھ میں میری وجہ سے آنسو نہیں آئیں گے
محراب، یہ زامون عبدالرحیم کا وعدہ ہے تم سے۔" وہ شخص
اس بار امین کتا یا تھا۔ محراب نے ٹپکس موند لی تھیں۔

گھنے بادلوں میں ڈوبتا چاند نہایت سرگوشی میں ایک اور
خوشبو بھری چاندنی رات کی پیشگوئی کر رہا تھا، محراب نے
چاند کی سرگوشی پر زیر لب مسکرا کر اپنا آپ مکمل طور پر اس
شخص کے سپرد کر دیا جو واقعی اس بار امین کتا یا تھا۔



Nadia Majid

www.naeyufaq.com